# جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشوونما

(تنقید و تحقیق)

ڈاکٹر برج پریمی


رچنا پبلی کیشنز

۱۳ نصیب نگر، پمپوش کالونی

جانی پورہ، جموں - ۱۱۰۰۰۷

C

پریمی رومانی

پہلی بار : ۱۹۹۲ء

دوسری بار : ۲۰۰۰ء

رچنا ایمہ نے
جے کے آفسیٹ پریس دہلی سے چھپوا کر
رچنا پبلی کیشنز۔ جموں (تلوی)
سے شائع کی۔

ترتیب و تہذیب :

پریمی رومانی

13.7.2000

9419192978

قیمت = /150 .Rs
ایک سو پچاس روپے

تقسیم کار :

۱۔ پاک بک چینل، پکا ڈنگا، جموں (تلوی)

Poona

۲۔ رچنا پبلی کیشنز
"تیسا" ۱/۱۳ نصیب نگر ہمپوش کالونی جانی پورہ جموں

۳۔ کتاب گھر
مولانا آزاد روڈ، سری نگر (کشمیر)

والِد مُحترم

پنڈت شیام لال ایمہ (مرحوم)

کے نام

"اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن"

ـــــــــ ڈاکٹر برج پریمی

اس کتاب میں

## جموّں و کشمیر میں اُردو ادب کے نمائندہ فنکار

# جانے والوں کی یاد آتی ہے

کتنے بے درد ہوتے ہیں جانے والے عجلت میں بھول جاتے ہیں کہ کیے گئے وعدوں کو الجھا کیا جاتا ہے۔" غالباً ۱۹۸۹ء کے ستمبر یا اکتوبر کا مہینہ تھا، پریمی ایک دن میرے دفتر آیا۔ باتوں باتوں میں نہایت اعتماد کے ساتھ کہنے لگا۔ "ساتی کشمیر کی تہذیب، تاریخ ثقافت اور لوک ورثے پر تم نے بہت اچھے مضامین لکھے ہیں مگر ان کا دائرہ کشمیری میں لکھے جانے کی وجہ سے محدود ہو کے رہ گیا ہے، میں نے اب کے پکا ارادہ کیا ہے کہ ان تمام مضامین کو اردو کے سانچے میں اُتار دوں تاکہ ان کا دائرہ وسیع تر ہو جائے۔" میں نے حامی تو نہیں بھری کیونکہ مجھے اس کی بگڑتی صحت کی پوری جانکاری تھی مگر اندر ہی اندر سوچ رہا تھا کہ اگر تراجم کا کام اُس نے ہاتھ میں لیا تو دنیا کی کوئی طاقت اُسے باز نہیں رکھ سکتی، پریمی کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ جب کام میں منہمک ہو جاتا تھا تو جم کر کام کرتا تھا۔ وہ ہر بات، ہر نقطے کو سمجھنے اور پرکھنے کی ممکن حد تک کوشش کرتا تھا

سعادت حسن منٹو کافی دیر سے ہم دونوں کا من پسند فنکار تھا۔ منٹو کی جو بھی چیز ہمارے ہاتھ لگتی ہم اُسے پڑھ کر ہی دم لیتے تھے۔ مگر جب پریمی نے پی ایچ ڈی کیلئے "منٹو" شخصیت اور فن موضوع چن لیا۔ اُس نے موضوع کا مکمل احاطہ کرنے کے لیے نئے سرے سے کام شروع کیا اور منٹو کی شخصیت اور فن کے بارے میں اتنا کچھ دریافت کیا کہ پڑھنے والے دنگ رہ گئے۔ پریمی کی کامیابی کی اس سے بڑھ کر کیا سند ہو سکتی ہے کہ کچھ عرصہ پہلے منٹو کے بارے میں دہلی سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں صاحب کتاب نے "منٹو: شخصیت اور فن" کتاب سے نہ صرف خوشہ چینی کی ہے بلکہ پورے کا پورا متن اُڑا لیا ہے اور اپنے کھاتے میں ڈالنے کے لیے الفاظ کی ترتیب اور جملوں کی ساخت میں معمولی سی ہیر اپھیری کی ہے[1] میں صاحب کتاب کو دوش نہیں دیتا کیونکہ مشرق میں اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔ خود کشمیری میں اس کی ایک نہیں درجنوں مثالیں موجود ہیں۔ خیر میرے کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ پریمی جب بھی کسی موضوع پر کام کرتا تھا وہ نئے گوشے دریافت کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاتا تھا۔ یہی انہماک اور لگن اُسے اردو ادب میں ایک مستقل مقام عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔ اُس نے جتنی جلدی تحقیق کے میدان میں منزلوں کو سر کیا، اُس کی نظیر ہمارے یہاں کم ہی ملتی ہے۔ شاید اس لیے کہ تحقیق کے میدان میں ابھی ابھی ہمارے یہاں خلوص اور نیک نیتی کا فقدان ہے۔ اکثر و بیشتر ایسی تحریریں ہمارے سامنے آتی ہیں جس میں تحقیق سے زیادہ ذاتی نام و نمود اور احباب نوازی کا عمل دخل ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے پریمی اس ادبی سرطان کا شکار نہیں تھا۔ میری دانست میں یہی سند ہے جو اُسے بقائے دوام کے دربار میں جگہ دلانے کیلئے کافی ہے۔ افسانہ نگاری کی سرحدوں سے نکل کر تحقیق کے میدان میں قدم جمانا

---

[1] ملاحظہ ہو جناب جگدیش چندر ودھاون کی کتاب "منٹو نامہ"

کوئی آسان کام نہیں۔ یہ چیز کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ پریمی کی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کا اُجاگر ہونا اُس مسلسل مطالعے کا شاہد ہے اور ذاتی تفکر کا نتیجہ ہے جو اُس نے کم و بیش چالیس سال تک جاری رکھا۔ اُس زمانے میں بھی جب اُس نے صرف افسانہ نگاری کو گلے لگائے رکھا تھا، پریمی کی تنقیدی بصیرت جب کبھی جاگ پڑتی تھی وہ ادب اور فن کے بارے میں اپنی آرا کا اظہار بلا جھجک کر دیتا تھا اور اپنی رائے کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتا۔ چھ دہائی میں میرے نام لکھے گئے پریمی کے خطوط اُس امر کے زندہ جاوید گواہ ہیں۔ ڈاکٹر عزیز احمد کے متنازعہ فیہ ناول "آگ" کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے اُس نے ۱۱ فروری ۱۹۵۷ء کو لکھا:-

"عزیز احمد کی آگ میں نے پڑھ ڈالی ہے۔ ایک اور بار پڑھنے کی خواہش ہے۔ عزیز احمد کے متعلق کہا گیا ہے کہ اُس نے کشمیر کو بدنام کیا ہے۔ میرے دل میں اُس کے خلاف ایک زہر تھا۔ آج وہ زہر دھل گیا ہے۔ کم از کم آگ میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں ملتی، جس سے کشمیر بدنام ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے کچھ کہانیاں ایسی لکھی ہوں مگر ناول جس کا کینواس کافی بڑا ہوتا ہے، جس میں بھرپور زندگی پیش کی جاتی ہے۔ بدنام کرنے کا بہت بڑا INSTRUMENT ہو سکتا تھا۔ عزیز احمد نے جس کشمیر کو پیش کیا ہے۔ وہ حقیقی کشمیر ہے۔ جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے۔ ایک کامیاب ناول لکھا گیا ہے جو بالکل اچھی طرح اور چستی سے بنا گیا ہے کہیں بھی ایسی چیز نہیں آئی ہے۔ جو فروعی ہو۔ ماسوائے

ابتدائیہ کے جہاں ایسے حالات بیان کئے گئے ہیں، جو
ناول سے زیادہ RELATED نہیں ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ پریم چند کے بعد اُردو کا سب سے
بڑا اور کامیاب ناول نگار عزیز احمد ہی ہے۔ جو غیر متوازن
باتیں کرشن چندر میں ملتی ہیں۔ عزیز احمد اُن سے مبرا ہیں
زبان بڑی پیاری ہے اور خاص ناول کی زبان۔ شاعری نہیں
عزیز احمد کا اپنا الگ اسلوب اور انداز بیان ہے۔

باہر کے لکھنے والے جن میں کرشن، راما نند ساگر، ٹھاکر
پونچھی اور منٹو بھی شامل ہیں ہمیشہ کشمیر کے پہاڑوں اور
دریاؤں کو پیش کرتے ہیں کسی نے بھی کشمیر کی راجدھانی
سرینگر کا پس منظر پیش نہیں کیا ہے۔ عزیز احمد کے ناول کا
پس منظر دوسری جگہوں کے علاوہ خاص طور سے سرینگر بھی ہے
جیتا جاگتا سری نگر۔ جہاں میں رہتا ہوں اور عزیز احمد کا
ہیرو سکندر رہتا ہے۔

کرشن چندر اور راما نند ساگر کو فخر ہے کہ وہ کشمیری ہیں لیکن
عزیز احمد نے جو کشمیری نہیں کشمیر کی ایک ایسی تاریخی سرشتے
پیش کی ہے کہ آدمی حیران ہو اُٹھتا ہے۔ ناول میں کشمیر کے
متعلق، اس کی تاریخ، کلچر، رہن سہن، تہذیب، رسم
و رواج معاشرت اور زندگی کے متعلق اتنی معلومات ہیں
کہ دنگ ہو کر چونکنا پڑتا ہے۔

عزیز احمد نے کشمیر اور اس کے بارے میں کافی بسیط مطالعہ
اور مشاہدہ کیا ہے جو کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آیا ہے

خود یہاں کے باسیوں کیلئے یہ کتاب نئی نئی باتوں کے مخزن لئے آئی ہے

عزیز احمد کے کردار یہاں کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ وہ ان میں رہا ہے۔ ان میں زندگی کے چند عزیز لمحے گزارے ہیں یہ کردار کرشن چندر کے رومان اور ہوائی کردار نہیں جو یا تو دق کا شکار ہوتے ہیں یا بھوک سے تنگ آکر خودکشی کرتے ہیں۔

آگ صرف ایک معمولی ناول نہیں۔ ایک تاریخی اور سیاسی تفسیر ہے۔ یہاں کے سماج، یہاں کی مقامی سیاست، یہاں کے جھگڑے۔ یہ سب باتیں آگ میں بھرپور ملتی ہیں لیکن ایک بات جو میں سمجھ نہ سکا وہ اس کا عنوان آگ ہے۔ عزیز احمد نے اسے آگ کیوں کہا ہے۔ اس کی سیاسی بیک گراؤنڈ کیا ہے، مظہری صاحب سکندر جو، النور جو، آفتاب یار جنگ یہ کون ہیں۔ یہ نام فرضی اور اشاریاتی ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے یہ جیتے جاگتے انسان ہیں۔ کون ہیں؟ یہ ایک سربستہ راز ہے"

اقتباس قدرے طویل ہوگیا ہے مگر واقعات کو اجاگر کرنے کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی تو نہیں ہے۔ اس نوعیت کی درجنوں مثالیں اُن کے خطوط میں موجود ہیں اور صفاحت کے ساتھ اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اس شخصیت کی تشکیل کا سلسلہ کافی پہلے شروع ہو چکا تھا جس شخصیت کو اردو دنیا برج پریمی کے نام سے جانتی ہے۔

ادب بچپن سے ہی پریمی کا اوڑھنا بچھونا تھا اور اردو کے

ساتھ اُنس اور محبت وہ شاید اپنے جنم سے ہی ساتھ لایا تھا۔ میں نے اُسے بار بار کشمیری میں لکھنے کی تحریک دی۔ میرے سامنے تو وہ اقرار ضرور کرتا تھا مگر بعد میں پھر اُس کا ارادہ بدل جاتا اور اُردو کے ساتھ اُس کا عشق پھر سے عود کر آتا۔ میرے اصرار پر اُس نے ضرور ایک کشمیری کہانی لکھی جو غالباً ۱۹۷۴ء کے "سون ادب" میں شائع ہو چکی ہے۔

"کشمیریات" سے پریمی کی دلچسپی اوائل صدی کی ساتویں دہائی سے شروع ہوئی۔ مطالعے اور مشاہدے کو مشعلِ راہ بنا کر جو دسترس پریمی نے مختصر سے وقت میں کشمیریات پر حاصل کی، وہ قابلِ ستائش ہے۔ کشمیر سے تعلق اُن کے بعض مضامین غور و فکر کی دعوت دے کر مزید تحقیق کے دریچے کھول دیتے ہیں۔

کشمیر میں اُردو کی نشو و نما کے سلسلے میں پریمی سے پہلے بھی کام ہوا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کی کتاب کشمیر میں اُردو کو اس ضمن میں کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس کتاب کو لکھنے کے دوران جو مدد پریمی نے سروری مرحوم کو بہم پہنچائی، وہ نہایت قابلِ قدر ہے۔ اگر پریمی کی مدد سروری کے شاملِ حال نہیں ہوتی تو کتاب کے نامکمل رہنے کا امکان تھا۔ میں ذاتی واقفیت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ کتاب کے لیے مواد جمع کرنے میں جس لگن اور دردمندی سے پریمی نے کام کیا وہ حد درجہ قابلِ تحسین ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کتاب کے سرنامے میں پریمی کا ذکر تک بھی نہیں ہوا ہے شاید اس کی وجہ سروری صاحب کی کتاب کی اشاعت سے پہلے موت واقع ہونا ہے۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، اس میں پریمی نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر واقعات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اُسے

ممکن حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ تحقیق اور تفتیش ایک مسلسل عمل ہے اور اس میں کوئی بھی دعویٰ کوئی بھی نتیجہ حرف آخر نہیں ہو سکتا۔ نئے واقعات، نئی سچائیاں سامنے آنے کے ساتھ "تحقیق" اور تفتیش کا شعبہ مزید وسعتیں حاصل کرتا ہے مگر جو کام ابتدا میں کیا جاتا ہے۔ اُس کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلمہ ہوتی ہے، اس میدان میں کسی بھی مقام یا مرحلے پر چین بچین ہونا تحقیق کے عمل کو پابہ زنجیر کرنے کے مترادف ہوگا۔ پریمی نے ریاست میں اردو کی نشو و نما کے سلسلے میں اچھا کام کیا ہے اور مستقبل کے محققین کے لیے تحقیق کی بنیادوں کو استوار کیا ہے۔ کتاب کا وہ حصہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں ریاست کے نمائندہ اردو فنکاروں پر قلم اٹھایا گیا ہے کتاب کے اس حصے میں توسیع کی مزید گنجائش ہے اور کچھ نمائندہ لوگوں کا اس میں ذکر نہیں ہوا ہے، جن میں مولانا محمد سعید مسعودی، شمیم احمد شمیم، شہ زور کاشمیری، دینا ناتھ مست، عبدالصمد وانی، میر عبدالعزیز، چراغ حسن حسرت کے نام نامی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ پریمی کتاب کو ایک مبسوط مربوط اور تاریخی دستاویز بنانے کے درپے تھے مگر حالات کی روش اور موت کے ظالم ہاتھوں نے اُسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ پھر بھی ہمارے سامنے جو کچھ بھی ہے وہ ہر لحاظ سے قابل قدر بھی ہے اور قابل غور بھی۔

پریمی کا بہت سارا تحریری مواد ابھی تک چھپ نہیں پایا ہے۔ ریاستی کلچرل اکادمی نے اُسے کشمیری زبان اور ادب کی تاریخ اردو میں لکھنے کا کام تفویض کیا تھا اور وہ اس منصوبے کو تکمیل کرنے کی خواہش سے سرشار تھے۔ اس سلسلے میں اُس نے مختلف ذرائع سے کافی مواد بھی اکٹھا کیا تھا۔ محمد حسیر سرمست کے لکھے گئے کشمیری مونوگراف کا اُس نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ جو شاید ساہتیہ اکادمی کی طرف سے

شائع ہو رہا ہے۔
میرے لیے تو یہ کتاب گنجِ گرانمایہ ہے اور میں دست بدعا ہوں
کہ ادبی حلقوں میں کتاب وہ مقبولیت حاصل کرے جس کی کتاب سچے
معنوں میں مقدور ہے۔

موتی لال ساقی
۲۷ جون ۱۹۹۱ء

# طبع ثانی

"جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما" والدِ محترم ڈاکٹر برج پریمی کے انتقال کے تقریباً دو سال کے بعد میں نے ۱۹۹۲ء میں ترتیب دے کر شائع کی تھی مجھے دلی مسرت ہورہی ہے کہ قارئینِ کرام نے اس کا مطالعہ کرنے میں غیر معمولی دلچسپی دکھائی۔ اس طرح سے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن بہت ہی قلیل عرصے میں ختم ہوگیا اور اب تقریباً سات سال کے بعد اس کی طبع ثانی کی طرف توجہ کی جارہی ہے۔ اس دوران جموں وکشمیر میں اُردو ادب کے حوالے سے جو بھی کام ہوا بعض محققین نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے جو نہایت ہی حوصلہ افزا بات ہے۔ لیکن اس کے برعکس بعض حضرات نے اس کتاب سے اکثر حصے نقل کرکے اپنے نام بغیر کسی اعتراف کے شائع کیے ہیں جو سراسر ادبی بددیانتی ہے۔

"جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما" کا تازہ ایڈیشن اس لحاظ سے قدرے مختلف ہے کہ والد صاحب کے کاغذات میں سے چند اور مضامین برآمد ہوئے جن کو میں نے کتاب میں شامل کیا ہے اور اس طرح نقشِ ثانی نقشِ اول سے بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اُمید ہے کہ آپ میری یہ کوشش پسند فرمائیں گے اور مجھے ہمیشہ کی طرح اپنے مشوروں سے نوازتے رہیں گے۔

پریمی رُومانی
۱۵ر اکتوبر ۱۹۹۹ء

"تپسیا"
۳/۱ نصیب نگر، ہمپوش کالونی
جانی پورہ - جموں ۱۸۰۰۰۷-

# جموں و کشمیر میں اردو نثر

ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان کی شروعات کوئی سَو سوا سو سال پہلے ہوئی۔ ڈوگرہ عہد سے قبل کشمیر میں افغانوں اور سکھوں کی عملداری رہی اور اہل کشمیر برسوں غلام در غلام رہے۔ اس زمانہ میں یہاں فارسی زبان اور ادب کا چلن رہا۔ کشمیریوں نے یہاں بھی اپنی ذہانت اور ذکاوت کا ثبوت فراہم کر کے اس زبان میں قابل قدر سرمایہ پیدا کیا۔ لیکن جب ڈوگرہ عہد کا آغاز ہوا اور مہاراجہ گلاب سنگھ (۱۸۴۶ - ۱۸۵۶ء) نے برطانوی مفادات کے پیش نظر کشمیر کو خریدا اور اس طرح ریاست جموں و کشمیر کی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ تب سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر دہلی اور لاہور کی حکومتوں کے ساتھ کشمیر سرکار کے تعلقات بھی قائم ہوئے جس کے نتیجے میں بعض لوگوں کا باہر آنا جانا ناگزیر بن گیا۔ عوامی سطح پر بھی وسائل معاش کی تلاش اور تجارتی مقاصد کے حصول کے لئے بھی ان تعلقات میں اضافہ ہوا۔ اس اختلاط

کا نتیجہ یہ ہوا کہ باہر جانے والے سیلانی اپنی فارسی دانی کے بدولت مروجہ اردو میں شدبد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ڈوگرہ عہد میں کچھ عرصہ تک نقیبوں کو ہندوستان کے مختلف شہروں سے بلا کر اپنے دربار میں اس غرض کے لئے تعینات کیا گیا تھا کہ وہ بھی ڈوگرہ دربار میں مغلیہ جاہ وجلال کا سا انداز پیدا کریں۔ چنانچہ جب مہاراجہ دربار میں آتا تھا تو اس کی آمد کا اعلان مغلیہ انداز سے کیا جاتا تھا۔ ان نقیبوں کے ساتھ ان کے پورے پورے خاندان بھی تھے۔ جن کی بول چال کی زبان اردو تھی۔ اس طرح سے بھی اردو زبان کا عمل دخل شروع ہوا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ کشمیر کی آبادی کا خاصا حصہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران ہندوستان کے دوسرے حصوں میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ان میں سے اکثر خاندان وہیں کی خاک میں جذب ہو گئے اور اردو زبان کی تیز رفتار ترقی سے متاثر ہو کر انہوں نے شعر وادب کے ایسے نادر گل بوٹے سجائے جن کا اپنا الگ مقام ہے۔

ڈوگرہ سلطنت کے بانی مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں ریاست کی درباری زبان فارسی تھی۔ لیکن خطۂ جموں کے بیشتر علاقوں میں ڈوگری زبانوں کا بول بالا تھا جو لسانی اعتبار سے پنجابی اور اردو کے قریب ہے۔ اس لئے اردو زبان یہاں پر اپنے ادبی خدوخال مرتب کر چکی تھی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷ - ۱۸۸۵ء) کا عہد مقابلتاً امن وسکون کا زمانہ تھا۔ مہاراجہ کو نئے علوم وفنون سے دلچسپی تھی۔ اس لئے نئے علوم کے ساتھ نئی تعلیم کی ترویج میں اس نے کافی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اپنی رعایا کو مغربی علوم وفنون سے آشنا کرنے کے لئے اس نے اپنے دربار میں عالم اور فاضل جمع کیے۔ ان میں بیشتر فارسی کے عالم تھے یہ فارسی زبان بھی بولتے اور لکھتے

تھے۔ مہاراجہ کا وزیر اعظم دیوان کرپا رام کئی فارسی کتابوں کا مصنف تھا۔ وہ اردو زبان میں بھی دست رس رکھتا تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے ریاست کی انتظامی صورت حال پر رپورٹیں مرتب کروائیں اور ان کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ یہ رپورٹیں اردو میں مرتب کی جاتی تھیں۔ ان رپورٹوں کو ریاست میں اردو نثر کا ابتدائی نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جب حکومت کی عنان سنبھالی اور ابتدائی برسوں کی مشکلات کے بعد حکومت میں استحکام پیدا ہوا تو مہاراجہ کو علم وادب کی اشاعت کا خیال آیا۔ چنانچہ مہاراجہ نے جموں میں ایک سنسکرت کالج قایم کیا اس کے علاوہ ایک لائبریری اور ایک دارالترجمے کا اہتمام بھی کروایا۔ اس دارالترجمے کے توسط سے سنسکرت اور فارسی کی کتابیں شایع ہوئیں اور بہت سے مسودے ڈوگری، ہندی اور اردو میں ترجمہ ہوئے۔ اس ادارے کے زیر اہتمام ریاستی نظم ونسق سے متعلق کئی رپورٹیں مرتب ہوئیں۔ ۱۸۸۲ء۔ ۱۸۸۳ء کے دوران تیار کی ہوئی ایک رپورٹ میں درج ہے:۔

"۴۵۰۲ روپیہ اجرت ترجمہ اس سال میں صرف ہوا اور سال حال میں کوئی کتاب جو انگریزی سے شاستری اور شاستری سے بھاشا اور عربی سے اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں، ختم ہوئی ہیں....."

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کی کتابیں جو عربی یا دوسری زبانوں سے اردو میں منتقل ہوئی تھیں ان کو باضابطہ طور پر شایع کیا جاتا تھا۔ اس عہد کے کئی مسودات ملتے ہیں جن میں سے اکثر انگریزی، فارسی اور عربی سے اردو میں ترجمہ ہوئے ہیں، اور ساتھ ساتھ دیوناگری حروف میں بھی لکھے گئے ہیں۔ ان مسودات کی تیاری میں غلام غوث خان، پنڈت بخشی رام، مولوی فضل الدین لالابت رائے

وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ عالم اور فاضل مہاراجہ کے دربار کے ساتھ وابستہ تھے اور انہوں نے طب، انجینیرنگ، منطق، تاریخ، مذہب، کاغذسازی، اناٹامی جیسے موضوعات سے متعلق مسودات تیار کئے۔ ان کی زبان صاف ستھری ہے۔ کہیں کہیں ادبی چاشنی ملتی ہے۔ جہاں کہیں انگریزی اصطلاحات کی ضرورت محسوس ہوئی ہے وہاں ان کو نہیں چھیڑا گیا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں ابھی اردو زبان کو ریاست کی سرکاری زبان ہونے کا منصب عطا نہیں ہوا تھا۔ لیکن زبان عام پڑھے لکھے لوگوں میں مقبول ہو رہی تھی۔ چنانچہ دارالترجمہ کے دائرہ عمل سے باہر بھی کئی نثری کارنامے وجود میں آئے۔ چودھری بہتہ شیر سنگھ نے ۱۸۶۴ - ۱۸۶۵ کے دوران بخارا کا سفر کیا۔ واپسی پر اس نے اردو میں اپنا سفرنامہ قلم بند کیا۔ یہ ریاست میں سرکاری طور پر پہلی اردو تحریر تسلیم کی گئی ہے۔ ۱۵۰ صفحات پر مشتمل یہ سفرنامہ بڑا دلچسپ ہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے کارناموں میں بدیا بلاس پریس کا قیام بھی ایک اہم کارنامہ ہے۔ یہ پریس ۱۸۸۲ء میں قایم ہوا۔ اسی سال ریاست کا پہلا اخبار بدیا بلاس سرکاری گزٹ کے طور پر جاری ہوا۔ یہ اخبار دیوناگری اور اردو دونوں حروف میں شایع ہوتا تھا۔

اس عہد کے اہم ادیبوں میں پنڈت ہرگوپال کول خستہ کا نام سرفہرست ہے۔ خستہ شبلی اور حالی کے ہم عصر تھے۔ وہ کشمیری الاصل تھے اور سال ہا سال ریاست سے باہر لاہور اور پٹیالہ میں رہ چکے تھے۔ قیام لاہور کے دوران وہ "راوی ریفارمر" "خیرخواہ کشمیر" "دیش کی پکار" اور اس قبیل کے کئی پرچوں کے ساتھ وابستہ رہ چکے تھے۔ لاہور میں ان کا تعارف پنجاب کے ڈائرکٹر تعلیمات کرنل ہالرایڈ کے ساتھ ہو چکا تھا۔ وہ

انجمن پنجاب کی کارکردگیوں سے بھی واقف تھے۔اس لئے نہ صرف یہ کہ وہ اپنے عہد کے نئے خیالات اور تصورات سے واقف تھے بلکہ اردو زبان کے مزاج سے بھی واقف تھے۔ خستہ اعلیٰ پایہ کے شاعر اور نثر نگار تھے۔ وہ ۱۸۷۶ء میں کشمیر آئے اور آتے ہی اپنی خداداد قابلیت کے باعث مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔

خستہ کے کئی نثری کارنامے ہیں۔ ان کی "گلدستۂ کشمیر" اردو نثر میں غالباً کشمیر کی پہلی تاریخ ہے۔ جو عہد قدیم سے لے کر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد کا احاطہ کرتی ہے یہ کتاب ۱۸۸۳ء میں لاہور سے شایع ہوئی۔ خستہ رنبیر سنگھ کے عہد کے چشم دید گواہ تھے۔ اس لئے تاریخی اعتبار سے بھی اس کتاب کی اہمیت ہے کتاب شستہ اور اس ثقالت سے پاک ہے جو اس سے قبل کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ خستہ کی دوسری تصنیف رسالہ "گلزار فواید" ہے۔ یہ دراصل ایک قصہ ہے جس میں ڈپٹی نذیر احمد کے مراۃ العروس کا تتبع کیا گیا ہے۔ اسلوب سلیس اور واضح ہے۔ کہیں کہیں مقفیٰ اور مسجع عبارت کا التزام کیا گیا ہے۔ خستہ کے نثری کارناموں میں ان کے انشا پیے بھی شامل ہیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجہ پرتاپ سنگھ ۱۸۸۵ء میں تخت نشین ہوئے۔ اس عہد تک اردو پڑھے لکھے لوگوں کا حلقہ بڑھ گیا تھا۔ اور اردو زبان ذریعہ اظہار بن گئی تھی۔ مہاراجہ نے اس زبان کی مقبولیت کے پیش نظر ۱۸۸۹ء میں اسے سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کر لیا۔

ہرگوپال کول خستہ کے چھوٹے بھائی سالگ رام سالک اس عہد کے دوسرے اہم نثر نگار ہیں۔ سالک کا ادبی ذوق بھی خستہ کی طرح لاہور کی ادبی فضاؤں میں پروان چڑھا تھا۔ وہ عرصہ دراز تک اودھ اخبار لکھنؤ میں مضامین لکھتے رہے۔

انہوں نے خود بھی لاہور سے اپنے بھائی کے ساتھ "خیر خواہ کشمیر" نام کا ایک ہفت روزہ جاری کیا تھا۔ اس عہد میں عیسائی مشنریوں اور مبلغوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ مغربی خیالات کی توسیع سے اور عیسائیت کی تبلیغ روکنے کے لیے مختلف مذاہب کے پڑھے لکھے لوگوں میں ہلچل پیدا ہوئی۔ اس دوران سالک کشمیر آچکے تھے۔ یہاں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی سرپرستی میں سناتن دھرم سبھا تشکیل ہوئی تھی۔ جس کے زیرِ اہتمام عیسائیوں کے خلاف کئی کتابچے تیار کئے گئے۔ سالک نے بھی مورتی منڈن، دھرم اپدیش اور شاستر ارتھ جیسی کتابیں مرتب کیں۔ اس کے علاوہ لغات اردو اور محاورات اردو کے نام سے بھی چھوٹی چھوٹی کتابیں مرتب کیں۔ سالک کی اردو خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انہوں نے رنبیر ڈنڈ بدھی (قانون تعزیرات جموں وکشمیر) کی مبسوط شرح تحریر کی۔ اس کے علاوہ مجموعہ ضابطہ دیوانی، قانون اراضی اور دوسری قانونی دستاویزات کی شرح بھی لکھی ہے۔ خالص ادبی کارناموں میں ایک اچھی تصنیف گنجینۂ فطرت یا مناظرِ فطرت کے نام سے شایع ہوئی ہے۔ "داستان جگت روپ" سالک کا ایک اور ادبی کارنامہ ہے۔ جو شایع نہ ہو سکا۔ "تحفۂ سالک" ایک سفرنامہ ہے۔ جس میں قصے کی تکنیک کا التزام کیا گیا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوایل میں لاہور اور دوسری جگہوں سے ریاست کا رابطہ اخبارات کے ذریعے قائم ہوا۔ ان اخبارات میں ریاست کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسایل پر مضامین شایع ہونے لگے۔ جس سے یہاں کے لوگوں میں صحافت سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور لکھنے والوں کی صلاحیت کو ابھرنے کا موقعہ دستیاب ہوا۔ محمد الدین فوقؔ کی مساعی اس ضمن میں نمایاں ہے۔ فوقؔ نے لاہور اور کشمیر سے مختلف اخبارات جاری کئے اور اپنے قلم کی توانائیوں کے ساتھ اہلِ کشمیر کو غفلت کی نیند سے بیدار کرنے

کا کارنامہ انجام دیا۔ فوق اپنے عہد کے سب سے بڑے ادیب تھے۔ انہوں نے ناول، افسانہ، سوانح، تذکرہ، تاریخ کے شعبوں میں متعدد کارنامے انجام دیئے۔

۱۹۲۴ء میں لالہ ملک راج صراف نے ریاست کا پہلا اخبار رنبیر جموں سے جاری کیا۔ اس اخبار کی اشاعت نے اردو نثر کی توسیع اور ترقی کے لئے راہیں کھول دیں۔ اور نئی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ فراہم کیا۔ اس طرح سے نئے نثر نگاروں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہوا۔ ان میں مولوی زین العابدین، سالگرام کول، جیالال کلم، مولوی عبداللہ وکیل، پریم ناتھ بزاز، کشپ بندھو، پریم ناتھ رونق، بلدیو پرشاد شرما، عشرت کشتواڑی، ن شاد کشتواڑی، دیاکرشن گردش، غلام حیدر چشتی، قیس شیروانی، تاراچند ترسل سالک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سری نگر کا پہلا اخبار "وتستا" پریم ناتھ بزاز کی ادارت میں ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد بزاز صاحب اور شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۳۵ء میں ہمدرد شائع کیا۔ ہمدرد ریاست کا پہلا مصور ہفت روزہ تھا۔ اسی سال کشمیری پنڈتوں کی انجمن کے پرچے "مارتنڈ" کا اجرا بھی ہوا۔ ان اخبارات نے صحافت کا ایک نیا معیار قایم کیا۔ ان اخباروں کے ذریعے نثر کی آبیاری ہوئی۔ اہم نثر نگار پردیسی، دینا ناتھ وار، یکوشاہد، نیاز کامراجی، انور پریمی، وشوا ناتھ درماہ، آنند کول بامزئی، شیام لال ایمہ، تیرتھ کاشمیری وغیرہ تھے۔ اس دور کی اہم نثری تصانیف پریم ناتھ بزاز کی کشمیر کا گاندھی، تیرتھ کاشمیری کی دیوتا و شوا ناتھ درماہ کی تلاش حقیقت اور اکتساف حقیقت اور سردانند پراغی اور آفتاب کول وانچو کی چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں۔

رنبیر، وتستا، ہمدرد اور مارتنڈ کے بعد آج تک اخبارات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء تک اخبارات کی تعداد ۷۴ تک پہنچ گئی تھی۔ آزادی کے بعد اس تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ ان اخبارات میں روزنامے

ہیں، ہفت روزہ بھی اور پندرہ روزہ بھی۔ دلیش، چاند، کیسری، خدمت، حقیقت، نور، جیوتی، آفتاب، سرینگر ٹائمز، نوائے صبح، اقبال، ہمارا استاد، کشمیر، سویرا، امر، پاسبان، سدرشن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ رسائل میں پریم، فردوس، کونگ پوش، تعلیم جدید، آزاد، گلریز، تعمیر، جیوتی، دیپک، ہما، جھرنا، کینواس، دلیش، ادبیات، شیرازہ، ہمارا ادب، بازیافت، اقبالیات قابل ذکر ہیں۔ مختلف وقتوں پر چھپنے والے ان رسائل نے کشمیر کے تخلیقی ذہن کی بازیافت کی اور اردو نثر کے امکانات روشن کیے۔

اردو نثر کی توسیع کے ساتھ ساتھ فکشن کے مختلف شعبے بھی معرض وجود میں آ گئے۔ چنانچہ افسانے، ناول، ڈرامے، ادب لطیف، انشائیے، تحقیق و تنقید غرض کہ ہر شعبے میں ریاست کے قلم کاروں نے اپنے قلم کی جولانیاں دکھائیں اور نہ صرف ریاست میں بلکہ پوری اردو دنیا میں اپنی دھاک جما دی۔ آج ہمارے کتنے ہی قلم کار ہیں۔ جن کی اردو دنیا میں اپنی پہچان ہے۔ اور جن کی آواز پایۂ اعتبار رکھتی ہے۔ فکشن کے شعبے میں پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، نرسنگھ داس نرگس، کشمیری لال ذاکر، موہن یاور، ٹھاکر پونچھی، علی محمد لون، غلام حیدر چشتی، نندلال بے غرض، دینا ناتھ دار، بھوشاید، شیام لال ایمہ، گنگا دھر دیہاتی، محمود ہاشمی، تیرتھ کاشمیری، سوم ناتھ زتشی، ہنسی نردوش، پشکر ناتھ، تیج بہادر بھان، حامدی کاشمیری، برج پریمی، ہری کرشن کول، کشوری منچندہ، جیو تیشور پتھک، لیش سروج، نور شاہ، امر مالموہی، ڈی کے کنول، مالک رام آنند، زمان آزردہ، رام کمار ابرول، شبنم قیوم عمر مجید اور دوسرے بیسیوں تابناک ستارے ہیں۔ جن کی تخلیقات ہر زمانے میں ذوق و شوق سے پڑھی جاتی رہی ہیں۔ ہمارے محققین اور ناقدین نے ادھر تنقید اور تحقیق کے میدان میں اچھا کام کیا ہے۔ ادبی تنقید کے ابتدائی نمونوں

میں محمد عمر نورالہی صاحبان کی معرکتہ الآرا تصنیف ناٹک ساگر تسلیم کی جا سکتی ہے۔ جو پہلی بار ۱۹۲۴ء میں لاہور سے شایع ہوئی۔ اس کتاب کو ڈرامانگاری کے فن پر پہلی اردو تصنیف تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ان ہی مصنفین نے امانت کی اندر سبھا مرتب کر کے شایع کی۔ اس میں مقدمہ اور حواشی شامل کر کے اس کی افادیت میں اضافہ کیا۔

عبدالاحد آزاد نے ۱۹۲۵ء میں حیات مہجور کے نام سے ایک چھوٹا مقالہ لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن ان کے ذوق جستجو نے اسے ایک مبسوط کارنامہ بنایا۔ جو اب کشمیری زبان اور شاعری کے عنوان سے تین جلدوں میں شایع ہوا ہے۔ اس قابل قدر اور معتبر تذکرے میں لال دید سے لے کر مہجور کے عہد تک بیشتر شعراء کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ ان میں معروف اور غیر معروف دونوں قسم کے شعراء شامل ہیں۔ لیکن اس کی اہمیت اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ آزاد نے تحقیق کے ساتھ تنقید کا حق ادا کیا ہے۔

دوسرے ناقدوں اور محققوں میں نند لال طالب، ڈاکٹر عزیز احمد قریشی، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، ڈاکٹر اکبر حیدری، پروفیسر لشپ، رحمان راہی، برج پریمی، موتی لال ساقی، کاشی ناتھ پنڈتا، امین کامل، بلدیو پرشاد شرما، شعل سلطان پوری، نشاط انصاری، رشید نازکی، ظہور الدین، عابد پشاوری، قیصر قلندر اور بیسیوں دوسرے قابل ذکر ہیں۔ ان ادیبوں، نقادوں اور محققوں نے ادب، تہذیب اور ثقافت کے مختلف پہلوؤں پر مضامین اور مستقل کتابیں تصنیف کیں۔ جو نہ صرف ان کی وسعت نظری پر دال ہیں بلکہ جن میں اسالیب کی رنگا رنگی بھی نظر آتی ہے۔

٭٭٭٭٭

# جموں و کشمیر میں اُردو افسانہ

بیسویں صدی کے آغاز میں پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم نے اردو افسانے کا پہلا چراغ روشن کیا۔ اسی صدی کے دوسرے اور تیسرے دہے میں یہ اردو کے نثری ادب کا سب سے مقبول شعبہ بننے لگا۔ ملکی سیاست کے شعور اور مغربی ادب کے مطالعے نے اس صنف میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کی اور اردو کا مختصر افسانہ معاصر زندگی کے سیاسی، سماجی اور نفسیاتی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے ترقی کے زینوں کو پھلانگنے لگا۔ اس کا اولین روپ "انگارے" کے افسانوں میں بھرپور توانائیوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۲ء میں شایع ہوا لیکن اس کے بیشتر افسانے ۱۹۳۰ء میں ہی مختلف رسالوں میں شایع ہو چکے تھے۔

ریاست میں اردو افسانے کی طرف سب سے پہلے مورخ، ادیب، شاعر اور صحافی منشی محمد الدین فوقؔ نے توجہ دلائی۔ اگرچہ فوقؔ نے زندگی کا بیشتر حصہ پنجاب میں گزارا

لیکن ان کے کشمیریت کے جذبے کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ فوق نے روِش زمانہ کے مطابق کئی تاریخی اور نیم تاریخی قصے قلمبند کیے جنہیں ہم ریاست میں اردو افسانے کے اولین نقوش کہہ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم مثال کے طور پر سبق آموز کہانیاں پیش کر سکتے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس میدان میں کس سے متاثر ہوئے لیکن بہر حال ان کے طبع زاد قصوں میں کہانی کا بنیادی کینڈا ضرور ملتا ہے۔ فوق کے بعد چراغ حسن حسرت کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کی ادبی حیثیت ہمہ جہت ہے۔ انہوں نے کس صنف میں اپنا قلم نہیں آزمایا؟ تاریخ دینیات، صحافت، شاعری، افسانہ۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "کیلے کا چھلکا" ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

مدِ نظر رہے کہ ابھی ریاستی سطح پر صحافت کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں ریاست کا پہلا اخبار "رنبیر" جموں سے لالہ ملک راج صراف کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔ اس نے ریاست کے قلم کاروں کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ فراہم کیا۔ "اخبارِ عام" اور "رنبیر" کے حلقے میں دوسرے لوگوں کے ساتھ پریم ناتھ سادھو رونق بھی شامل ہوئے اور اپنی ادبی زندگی کی شروعات شعر و شاعری سے کی۔ لیکن ۱۹۳۲ء کے بعد وہ نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔ رونق کو ادب اور خاص طور پر کہانی کی صنف کی طرف متوجہ کرنے کی تحریک ان بزمی محفلوں سے ملی جو ان کے ادب نواز دادا پنڈت مکند کول کے گھر میں منعقد ہوا کرتی تھیں، جہاں شعر پڑھے جاتے تھے اور اقبال اور چکبست کے ساتھ ساتھ پریم چند اور ٹیگور کی کہانیاں بھی پڑھی جاتی تھیں اور ان پر اظہارِ خیال ہوتا تھا۔ رونق جو بعد کے برسوں میں پردیسی کے نام سے مشہور ہوئے، ان محفلوں سے تحریک پا کر شعر و ادب کی دنیا میں آ گئے۔ شعر کہنا شروع کیے لیکن یہ میدان راس نہ آیا۔ دراصل وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے، شعری وسیلے سے اس کا بھرپور اظہار نہیں ہو پاتا تھا۔ اس دوران پریم چند کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ سجاد حیدر یلدرم، اعظم کریوی، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری

کے افسانوں کی دھوم مچی تھی۔ پریم چند مثالیت پسندی سے حقیقت پسندی کی طرف آگئے تھے اور نئے فنی تصورات اور امکانات کے ساتھ معاشرتی اور سیاسی زندگی کو پیش کرنے لگ گئے تھے۔ یلدرم، نیاز، مجنوں اور سلطان حیدر جوش رومانی دبستان کی بنیاد ڈال چکے تھے اور تخیلی افسانے لکھ رہے تھے۔ ٹیگور کے ادب لطیف کے ترجموں نے زبان و بیان کا جادو جگایا تھا۔ اسی فضا میں پردیسی کا ذہن پروان چڑھا اور وہ ادب لطیف اور نثری شاعری کے ادب پارے تخلیق کرنے لگے۔ لیکن پھر "انگارے" اور پریم چند کے "کفن" کی اشاعت نے ان کے ذہن کو مکمل طور سے بدل دیا۔ اس زمانے میں ڈوگرہ شاہی کے جبر و استبداد کے خلاف ہماری تحریکِ آزادی کا آغاز ہوا تھا جو شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی تھی۔ پردیسی جیسا حساس فنکار ان تمام باتوں سے دامن نہ بچا سکا۔ چنانچہ ابتدائی دور کے ادب لطیف اور راجو کی ڈولی، پارسل، ماں کا پیار، بے کار، سنتوش، حسین پیامبر، سندھیا کا شراپ اور "شام و سحر" (اولین مجموعہ) کی کئی کہانیوں کی طرح، جن میں زندگی کی مہک سے خالی رومان اور جذبات سے بھرے ہوئے خواب ہیں۔ ان کا رومانی اسلوب آہستہ آہستہ بدلنے لگتا ہے اور ان کے بجائے وہ سیدھے سادے انداز کو اپناتے ہیں۔ وہ اپنے فن کو جس میں موضوع سے قطع نظر انسانی نفسیات کی باریکیاں ضرور نظر آتی ہیں اب زندگی کے خارزار میں پہنچا دیتے ہیں اور آخری سانس تک صحیح معنوں میں کشمیر اور کشمیریت کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

پردیسی کے افسانوں کے دوسرے مجموعے "دنیا ہماری" کا اسلوب "شام و سحر" کے افسانوں سے مختلف ہے اور بقول راجندر سنگھ بیدی "یہ افسانے اپنی سادگی اور معصومیت کی بنا پر ٹالسٹائی کی یاد دلاتے ہیں۔ پردیسی کی بیشتر کہانیاں اپنی منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں مشاہدے اور مطالعے کا خلوص ملتا ہے۔

پردیسی کے فن کا آخری دور ۱۹۴۷ء کے آس پاس شروع ہوتا ہے۔ اب ان کے شعور میں پختگی پیدا ہو چکی تھی۔ ڈوگرہ شاہی کا شخصی نظام آخری ہچکیاں لے رہا تھا اس لئے ان کی تانا شاہی اور جور و استبداد میں اضافہ ہو چکا تھا۔ مہاجنی نظام کے استحصال کے خلاف پردیسی نے بھرپور وار کیا۔ "بہتے چراغ"[۵] اور دوسرے غیر مطبوعہ مسودات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کے لہجے میں زہرناکی پیدا ہو چکی تھی۔ وہ کشمیر کے مخصوص معاشرے کے تناظر میں کشمیریوں کے مزاج، ان کی اخلاقی قدروں ان کی آرزومندیوں اور ان کی جدوجہد حیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ اس زمانے میں بالک رام باری اور کئی دوسرے ناموں سے بھی لکھتے ہیں۔ اس دور میں لکھی ہوئی کہانیاں پردیسی کی نمائندہ کہانیاں ہیں اور مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ زبان کا برتاؤ، لہجے کی چستی اور بیان کا اختصار بھی ان کے فن کو نکھارتا ہوا نظر آتا ہے۔ ریاست میں اس سے پہلے اردو کا مختصر افسانہ اس قدر منجھی ہوئی صورت میں نظر نہیں آتا۔ پردیسی نے کشمیر کو اپنے افسانوں میں پہلی بار پیش کیا اور ہزاروں لاکھوں کشمیریوں کو زبان بخشی۔

پردیسی کے قریبی معاصرین میں پریم ناتھ در کا نام اہم ہے۔ وہ پردیسی کے بعد اس میدان میں آئے اور بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں اچانک اردو افسانے کے آسمان پر طلوع ہوئے۔ شروع شروع میں وہ پردیسی، رلا مند ساگر اور دوسرے مقامی تخلیق کاروں کے ساتھ سرینگر کی ادبی انجمنوں میں شریک ہوئے لیکن انہوں نے اپنے فن کا لوہا ۱۹۴۷ء کے بعد منوایا۔ در کا بیشتر وقت کشمیر سے باہر گذرا لیکن وہ کسی حال میں بھی کشمیر کو نہیں بھولے۔ پردیسی کے ساتھ اور ان کے بعد جس افسانہ نگار نے کشمیریت کا احساس دلایا ان میں در کا نام سرفہرست ہے۔ پردیسی ہی کی طرح در نے بھی کشمیر کی جنت کا ذکر بہت کم کیا ہے بلکہ بقول سید احتشام حسین "کشمیر جو بار بار ان کے افسانوں میں آتا ہے اپنی وہ جنت بدوش عظمتیں لئے ہوئے نہیں آتا جن سے

رومانوں کا افسوں جگانے کے لئے فضا تیار ہوتی ہے۔ بلکہ ان میں وہ غم آلود اور نشتر آگیں کسک بھرتا ہے جس سے ہم کشمیر کی حقیقت کے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں[1] اور وہ حقیقت یہاں کی ناداری، بھوک اور جاگیردارانہ نظام کی ماری ہوئی زندگی ہے۔ پریم ناتھ در کے ہاں غضب کا باریک مشاہدہ نظر آتا ہے۔ وہ اس بے چارگی اور لاچاری کی تہوں تک ٹٹول کر نیچے جاتے ہیں اور ان حقایق کو بے نقاب کرتے ہیں۔ جس نے یہاں کے عوام کو افلاس اور بھوک کی اندھی غاروں میں دھکیل دیا تھا۔ درؔ کے موضوعات ہماری آس پاس کی زندگی اور اس سڑے ہوئے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں اور ان میں زندگی اس قدر قریب محسوس ہوتی ہے۔ جیسے ہمارے پاس سانس لے رہی ہو۔ درؔ کا فنی کمال اس تاثر اور فضا کے باعث ہے جن سے ان کا افسانہ عبارت ہے۔ اس کیفیت کو پیدا کرنے کے لئے ان کے اسلوب کی سادگی اور زبان و بیان کا متناسب استعمال کافی حد تک ذمہ دار ہے۔ ان کے یہاں تشبیہات اور استعارات کا ایسا نادر خزانہ ہے جس پر رشک آتا ہے۔ پریم ناتھ درؔ کے افسانوں کے صرف دو مجموعے شایع ہوئے ہیں۔ "کاغذ کا واسدیو" اور "نیلی آنکھیں"۔ اس کے علاوہ برِصغیر کے رسالوں میں ان کے افسانے شایع ہو چکے ہیں اور نہ صرف یہ کہ ریاست میں ان کا نام ہے بلکہ اردو کے افسانوی ادب میں وہ ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ درؔ کا محبوب موضوع انسان اور انسانی سرشت ہے۔ ان کا یہ مطالعہ اس قدر گہرا ہے کہ اس پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔

پردیسی کے معاصرین میں کئی اور نام شامل کئے جا سکتے ہیں جنہوں نے ریاست میں اردو افسانے کو وقار بخشا اور اپنے اپنے انداز سے مختلف سیاسی سماجی اور معاشرتی مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ ان میں سے بیشتر لوگ ٹیگورؔ اور پریم چندؔ کے ابتدائی دور کی کہانیوں

---

[1] پریم ناتھ در "کاغذ کا واسدیو" پیش لفظ

سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے شایع نہیں ہوئے۔ البتہ یہ لوگ بھی کافی عرصہ تک لکھتے رہے اور مقامی اخبارات میں ان کی کاوشیں شایع ہوتی رہیں۔ ان میں خاص طور پر دینا ناتھ والی کو، تیرتھ کاشمیری، شیام لال ایمہ، ویرولشیشور، نند لال بے غرض، دینا ناتھ دلگیر، اسیر کاشمیری، اکبر عسکری، کوثر سیمابی، کیف اسرائیلی، محمود ہاشمی، دیا کرشن گردش، عزیز کاش، مجوبہ یاسمین، صاحب زادہ محمد عمر، کاشی ناتھ کنول، گلزار احمد فدا، جگدیش کنول غلام حیدر چستی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

اسی دور کے لکھنے والوں میں رامانند ساگر، قدرت اللہ شہاب، نرسنگھ داس نرگس (ملا رام کوٹی) کشمیری لال ذاکر، گنگا دھر دیہاتی کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں۔ ساگر، شہاب اور ذاکر اب ریاست میں نہیں، لیکن ان کی کہانیوں میں اور خاص طور پر ابتدائی کہانیوں میں اس سرزمین کی بوباس کا احساس ہوتا ہے۔ شہاب مستقل طور پر پاکستان چلے گئے اور اب ان کا انتقال ہو چکا ہے اور رامانند ساگر بھوری کدل کی گلیوں کو ترک کر کے بمبئی کی فلمی دنیا کے گلیمر میں کھو گئے۔ اور کافی اچھی فلمیں بنائی ہیں۔ ذاکر اپنے تخلیقی کارناموں میں مسلسل معروف ہیں۔ انسانی زندگی اور استحصالی نظام میں پسے ہوئے عوام (شروع کی کہانیوں میں) ان کے خاص موضوع ہیں۔ اس پہان کا قابلِ رشک اسلوب۔ ذاکر نے اردو کی افسانوی دنیا میں اپنا مقام بنالیا ہے۔ گنگا دھر دیہاتی بڑے نودنولیس تھے۔ کافی عرصہ تک صحافت کے ساتھ وابستہ رہے۔ دیہاتی اور دل کش کاشمیری کے قلمی نام سے ریاستی اور ملکی رسایل میں کہانیاں لکھتے تھے۔ انہوں نے بہت پہلے منی کہانیاں لکھنا شروع کی تھیں۔ جو کافی مقبول ہوئیں۔ دیہاتی نے بھی اپنے معاصرین کی طرح سیاسی اور سماجی مسایل کو اپنا موضوع بنالیا تھا۔ انہوں نے معاشی اور اقتصادی بدحالی، سرمایہ اور محنت کی کش مکش اور اپنے عہد کے دوسرے سماجی مسایل کو کہانیوں میں ڈھالا تھا۔ ان کا کوئی مجموعہ شایع نہ ہو سکا کہانی کے فن اور تکنیک کی تازہ کاری

کا جس قدر رادراک دیہاتی کو تھا۔ ریاست کے بہت کم کہانی کاروں کو حاصل ہو سکا۔ نرسنگھ داس نرگس عرصہ دراز تک مولارام کوٹی اور پریم منوہر کے نام سے لکھتے رہے ہے۔ ان کے کئی مجموعے شایع ہو چکے ہیں جن میں "دکھیا سنسار" اہم ہے۔ صحافت سے وابستہ ہونے کے باوجود نرگس بہت اچھی کہانیاں لکھتے رہے۔ ان کی کہانیوں میں دیہاتی زندگی کی عکاسی خاص طور پر نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ اپنے وطن کی بدحالی اور جاگیردارانہ نظام کے استحصالی کو اپنی کہانیوں میں بے نقاب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو افسانہ کئی زینے طے کرتا ہوا آگے بڑھا ہے۔ نہ صرف موضوع کے اعتبار سے افسانے کا کینڈا بدل گیا ہے بلکہ فن تکنیک اور تکنیک کے برتاؤ کے اعتبار سے بھی افسانہ کہیں سے کہیں پہنچا ہے۔ اس دور سے قبل اور اس کے بعد پردیسی، درد، دیہاتی، ذاکر مسلسل لکھتے رہے۔ لیکن اس فہرست میں کئی اور ناموں کا اضافہ ہوا۔ خصوصی طور پر ٹھاکر پونچھی، موہن یاور وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے ۱۹۴۷ء سے قبل ہی لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ اپنے چونکا دینے والے انداز تحریر سے قارئین کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ ۴۷ء کے بعد ان کے فن نے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ ٹھاکر نے اپنے افسانوں میں پونچھ اور جموں کے آس پاس کی زندگی کے رنگ بھر دیئے ہیں اور اپنے منفرد اسلوب سے اپنا مقام بنا لیا۔ موہن یاور منجھے ہوئے فن کار ہیں۔ وہ کہانی کے فن پر قادر ہیں۔ منٹو اور بیدی کی طرح الفاظ کے کم از کم استعمال سے تاثر کی وحدت قائم کرتے ہیں۔ موہن کے یہاں عصر حاضر کے انسان کا درد و کرب ملتا ہے۔ "سیاہ تاج محل" "وسکی کی بوتل" اور "تیسری آنکھ" میں موہن یاور کے فن کی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔

۱۹۴۷ء۔ ۱۹۴۸ء میں ہماری ریاست سیاسی اختیار سے ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔ اس کا اثر خصوصی طور پر یہاں کی سماجی، ثقافتی اور ادبی زندگی پر بھی پڑا۔

نئے تقاضوں کے پیش نظر "قومی کلچرل فرنٹ" کی بنیاد پڑی اور گوشہ نشینی میں پڑے ہوئے ہمارے فن کار بھی میدان میں کود پڑے۔ کلچرل فرنٹ کی بنیادوں پر کلچرل کانگریس کی عمارت کھڑی ہوئی اور یہاں سے ہماری ثقافتی اور ادبی زندگی کا احیائے نو ہوتا ہے۔ کلچرل کانگریس کے سائے تلے ڈوگری اور کشمیری زبانوں کے شعر و ادب کی آب یاری ہوتی رہی نئے لکھنے والوں کا ایک کارواں سامنے آیا۔ اردو افسانے کے میر کارواں پریم ناتھ پردیسی ہی تھے۔ نئے لکھنے والوں میں سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، اختر محی الدین، بنسی نردوش، دیپک کول، ربھ بہادر بھان، وید راہی اور کچھ عرصہ بعد پُشکر ناتھ، حامدی کاشمیری، برج پریمی، امیش کول، ہری کرشن کول، غلام رسول سنتوش، جگدیش بھارتی، برج کتیال، زیڈ بیمی، نور شاہ، محمود بدخشی، وجیہہ احمد اندرابی، رام کمار ابرول وغیرہ اس کارواں میں شامل ہوئے اور اپنی کہانیوں میں نئے تقاضوں کی ترجمانی کی۔ ان لوگوں کے یہاں موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے نئے تجربے ملتے ہیں۔ یہ افسانہ نگار ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ اس لئے ان کے یہاں محنت کش طبقہ اور ریاستی عوام کی ترجمانی کا احساس ہوتا ہے۔ اس دور تک آتے آتے ہمارا افسانہ قدیم روایتوں سے انحراف کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ چنانچہ ان افسانہ نگاروں کے یہاں خیالی خوش رومان کے رنگ نظر نہیں آتے بلکہ حقیقت کی تلخیاں سامنے آتی ہیں۔

اختر محی الدین نے اپنے ادبی سفر کا آغاز اردو افسانہ نگاری سے کیا۔ اس کے بعد وہ کشمیری میں لکھنے لگے۔ کشمیری زبان کے افسانہ نگاروں میں آج ان کا نام سرِ فہرست ہے لیکن اردو میں ان کی شروعات کسی طرح بھی کم تر درجہ کی نہیں۔ "پونڈر پچھ" نام کی کہانی میں انہوں نے اپنے باطن کا کرب جس طرح انڈیل دیا تھا۔ وہ ان کی فن کارانہ صلاحیت پر دال تھا۔ یہ کہانی اس سال کی بہترین کہانی قرار دی گئی اور ایک غیر ریاستی اخبار کے "مختصر افسانے کے مقابلے" میں پہلے نمبر پر آگئی تھی۔ اختر کی کہانیوں میں مشاہدے کی گہرائی

ملتی ہے وہ اپنی بات برجستہ انداز میں کہتے ہیں۔ اسلوب میں مزاح کی چاشنی ہے اور مزاح کی شکر میں لپٹا ہوا طنز اسے دو آتشہ بنا دیتا ہے۔ تیج بہادر بھان ۱۹۵۱ء سے لکھتے آرہے ہیں اور اب تک لکھ رہے ہیں۔ کلچرل کانگریس کے ساتھ وابستگی کے باعث شروع میں "لال چینزی" اور "سرمایہ دار کا خواب" جیسی کہانیاں لکھیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ تیج کا فن نکھرتا گیا اور آج ان کے یہاں کہانی کے فن کا ایک بھرپور اور نکھرا ہوا انداز ملتا ہے۔ تیج اس فن میں کسی کے مقلد نہیں۔ وہ نہ کسی فارمولے کے پابند ہیں اور نہ کسی تکنیک کے۔ انہوں نے اپنے لئے ایک مخصوص تکنیک وضع کرلی ہے۔ تیج نے کلچرل کانگریس کے زمانے میں ہی اپنی کہانی "وانکین" سے لوگوں کو چونکا دیا جو خواجہ احمد عباس کے رسالے "سرگم" میں چھپی تھی اور جس نے انعام بھی حاصل کیا تھا۔ تیج کے یہاں زبان کا برتاؤ عام طور سے عدم صحت کی وجہ سے ان کے معترضین کا نشانہ رہا ہے۔ "جہلم کے سینے پر" سے "عورت" تک تیج بہادر بھان نے خاصا تخلیقی سفر طے کیا ہے۔ ان کے خاص موضوعات میں نفسیاتی اور سماجی مسایل ہیں جن کو انہوں نے تخلیقی آرٹ کے حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔

دیپک کول میں ایک اچھے کہانی کار کی سب خوبیاں موجود تھیں۔ لیکن اب وہ ہندی میں لکھنے لگے ہیں اور عرصہ سے اردو میں ان کی کوئی کہانی نظر سے نہیں گذری ہے۔ دیپک بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور کلچرل کانگریس کے سرگرم رکن تھے۔ دیپک کول کو زبان پر قابل رشک حد تک قدرت حاصل تھی۔ ہندی اور اردو کی آمیزش سے انہوں نے اپنا اسلوب نکھارا تھا۔ ان کے موضوعات میں بھی وقت کے تقاضوں کی گونج تھی۔ شیڈرک کے نام ایک خط، جب گدھ ڈوب گئے، بات کل رات کی، ناقابل فراموش کہانیاں ہیں۔ امیش کا "یاقوت" دائرے اور مرکز، بسنی نردوش کا "تارسوت" لون کا پاپی پجاری بت شکن اور سکھ کا ساحل، سنتوش کا

"خزاں کی خوشبو" اسی دور میں لکھی گئیں اور توجہ کا مرکز بن گئیں۔ ستارہ سوت اس دور کی نمایندہ کہانی تھی۔

پشکر ناتھ دورِ حاضر کے اہم کہانی کار ہیں۔ ان کے تین مجموعے "اندھیرے اُجالے" "ڈل کے باسی" اور "عشق کا چاند اندھیرا" شایع ہو چکے ہیں۔ پشکر نے ایک رومان نگار کی حیثیت سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا وہ "بیسویں صدی" دہلی کے توسط سے کشمیر میں پہچانے گئے لیکن بہت جلد انہوں نے اپنے منصب کو پہچان لیا اور رومانوں سے اتر کر انہوں نے کشمیر کی زندگی کے کرب کو اپنے افسانوں میں ڈھال دیا۔ پشکر کا مشاہدہ عمیق ہے وہ فلسفہ نہیں بگھارتے اور نہ سیاست کے کرتب دکھاتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی سے اپنی کہانیوں کا مواد اخذ کرتے ہیں۔ پشکر ناتھ کی کہانیوں میں جذبے اور احساس کا ادراک ملتا ہے اور ایک منجھا ہوا شعور بھی۔ ان کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے جس کی مدد سے انہوں نے خوب سے خوب تر لکھا ہے۔ پشکر نے اپنے طویل تخلیقی سفر کے دوران فارم کے کئی تجربے کئے ہیں۔ کئی کہانیاں انہوں نے ناول کی تکنیک میں لکھی ہیں بعض میں داستانی تکنیک کا التزام کیا ہے اور بعض میں صرف بیانیہ انداز ملتا ہے۔ کہیں کہیں چشمۂ شعور کی تکنیک کو بھی برتا ہے۔ پشکر ناتھ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ بدلے ہیں۔ مشاہدے کے ساتھ ساتھ ان کے مطالعے کا آہنگ بھی ان کی نئی کہانیوں میں نظر آتا ہے۔

نور شاہ بنیادی طور شاعرانہ ذہن رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب بھی شاعرانہ ہے جس سے ان کی کہانیوں میں قوس و قزح کے رنگ آ گئے ہیں۔ اور اس خصوصیت نے نور کے افسانوں کو ایک انفرادیت بخش دی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ نور شاہ افسانہ بننے کے گُر سے بھی واقف ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی مجبوریوں اور ناکامیوں کی کہانیاں لکھتے ہیں۔ جس سے ان کے افسانوں میں غم کی ہلکی ہلکی کسک پیدا ہو گئی ہے۔ انسانی

نفسیات کا مطالعہ بھی نورشاہ کے متنوع موضوعات میں شامل ہے۔ بے گھاٹ کی ناؤ، من کا آنگن اداس اداس اور گیلے پتھروں کی مہک جیسے کئی افسانے قابل قدر ہیں۔

حامدی ایک اور اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے 'وادی کے پھول'، 'برف میں آگ'، 'سراب' وغیرہ شایع ہو چکے ہیں۔ حامدی بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ یہی شاعرانہ اسلوب ان کے افسانوں کی مانگ کا سیندور ہے۔ شروع میں ان کے یہاں ترقی پسند تحریک کا غیر واضح اثر جھلکتا ہے اور وہ سماجی مسایل کی طرف توجہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بعد میں انہوں نے اپنے شخصی تجربات کو افسانہ کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی اور سماجی اقدار کی پامالی، رشتوں کی شکست و ریخت اور دوہری شخصیت کی نفسیات کے موضوع پر کئی کامیاب افسانے لکھے۔ اس ضمن میں ان کا افسانہ "ملموں کا سفر" مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ حامدی جدیدیت کے رجحان سے متاثر ہیں اور ابتدائی دور کی رومانی اور سماجی کہانیوں سے داخلیت کے پیچیدہ رجحان تک ان کے یہاں کئی تجربے ملتے ہیں۔

اس دور کی دوسری اچھی کہانیوں میں برج کیتیال کے "موت کے راہی" محمود بدخشی کی نیل کمل مسکائے، یہ خلش کہاں سے ہوتی، برج پریمی کی ہنسی کی موت، سپنوں کی شام، چلمن کے سایوں میں، اپیش کول کی "دائرے اور مرکز" ہری کرشن کول کی کئی کہانیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کہانی کاروں کے یہاں بھرپور عصری شعور ملتا ہے۔ ان میں بہت سے افسانہ نگار اب تک مسلسل لکھ رہے ہیں۔ چنانچہ تیج بہادر بھان، کشمیری لال ذاکر، پشکر ناتھ، موہن یاور، برج پریمی، نور شاہ اور بہت سے دوسرے لوگ اردو افسانے کی آب یاری کر رہے ہیں اور فکر و شعور کی پختگی کے ساتھ نئے فنی تجربوں میں مشغول ہیں۔

۱۹۶۵ء کے آس پاس اردو میں نئے افسانے کی شروعات ہوتی ہیں اور اب

افسانہ نئی سمتوں کی طرف مڑنے لگتا ہے۔ نہ صرف موضوعاتی تازگی اور اسلوب کی شادابی کے لئے راہیں متعین ہونے لگتی ہیں۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ افسانہ زندگی کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کو منعکس کر رہا ہے۔ زندگی میں جو اضطرار اور اضطراب پیدا ہوا ہے۔ اسی سے افسانہ عبارت ہو گیا ہے۔ سائنس اور تکنیک کی تبدیلیوں نے جہاں دوسری تبدیلیاں پیدا کی ہیں وہاں عقائد ٹوٹ گئے ہیں۔ انسان ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن گیا ہے۔ زندگی کے مسایل سے نبرد آزمائی اور قدروں کی شکست و ریخت کی وجہ سے فن کار بھی خارج سے باطن کی طرف مراجعت کرنے لگ گیا ہے۔ اردو کا افسانہ آہستہ آہستہ عصری زندگی کے ان مسایل کو سمیٹتا ہوا، روایت سے انحراف کرتا ہوا نئے علائم، تشبیہ و استعارات کے سہارے نئے آگے بڑھنے لگتا ہے۔ یہ خارجی اور معروضی سمتوں سے دامن بچاتا ہوا موضوعی، داخلی اور ذاتی بننے لگتا ہے۔ اسلوب میں سادگی، سپاٹ پن، غیر مرصع اور غیر رنگین انداز پیدا ہونے لگتا ہے اور افسانہ تجریدی اور علامتی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔

۱۹۶۰ - ۱۹۶۵ء کے بعد ہمارے یہاں نئے افسانہ نگاروں کا ایک کارواں جنم لیتا ہے۔ نئے کہانی کاروں میں عمر مجید، کشوری منچندہ، وریندر پٹواری، شمس الدین شمیم، مالک رام آنند، او پی سارتھی، ایش سروج، ڈی کے کنول، امر مالموہی، راجیش گوہر، کلدیپ رعنا، موتی لال کپور، جوتیشور پتھک، شبنم قیوم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سب باصلاحیت کہانی کار ہیں اور انہوں نے نہ صرف روایتی انداز کی کہانیاں لکھی ہیں بلکہ روایت سے انحراف کر کے نئے اور تازہ موضوعات کو اسلوب کی ندرت اور تازہ کاری سے اردو افسانے کو ترقی کی نئی سمتیں عطا کی ہیں۔ ان کے یہاں ہلکے پھلکے رومانات بھی نظر آتے ہیں اور عصری زندگی کی زخمی تمنائیں بھی ملتی ہیں۔ اردو افسانہ ریاست میں کسی جمود کا شکار نہیں۔ یہاں کے کہانی کار اپنے خون جگر

سے اسکی آبیاری کرنے میں معروف نظر آتے ہیں اور عصر حاضر کے انسان میں جو بے سروسامانی کرب اور تنہائی کا احساس پیدا ہوا ہے۔ اسکی ترجمانی جدید دور کے افسانہ نگار کر رہے ہیں۔ ان میں خاص طور پر آنند لہر، انیس ہمدانی، غمگین غلام نبی، سومناتھ ڈوگرہ، راجہ نذر بونیاری، مسعود ساموں، جان محمد آزاد، فاروق رینزو، نظیر نذر، زاہد مختار، کے، ڈی، مینی، اشرف آثاری، یاسین فردوسی، عبدالرشید فراق، اور غلام رسول آزاد، واجدہ تبسم، وحشی سعید ساحل، اشوک پٹواری، مشتاق مہدی، زاہد مختار حمیداللہ بٹ وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ ان افسانہ نگاروں کے تجربوں میں وہ وسعت نہیں ہے۔ جو انکے پیش روؤں میں موجود تھی۔ لیکن انکے بعض افسانوں کو پڑھکر یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان کا مستقبل درخشاں ہے۔

ریاست میں اردو افسانہ مقابلتاً ایک کم سن صنف ہے اور اس بات کے باوصف کے یہاں کے کہانی کاروں کو اپنے افسانوں کی اشاعت کے سلسلے میں وہ سہولیات اور مواقع میسر نہیں ہوئے یہاں اردو افسانہ نگاری کے میدان میں جو کام ہوا ہے۔ وہ فنی لحاظ سے تیسرے درجے کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ بعض کہانیاں ایسی ہیں کہ انہیں بلا مبالغہ اردو کی بہترین کہانیوں کے ادب میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

# جموں وکشمیر میں اردو ناول کے خدوخال

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کی تاریخ مختصر افسانہ کے بہ نسبت اس قدر روشن نہیں ہے اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ریاست سے کوئی اخبار شایع نہیں ہوتا تھا۔ مغرب میں اور خود ہندوستان میں فکشن کی ترویج اور اشاعت کے سلسلے میں اخبارات اور رسایل کا نمایاں رول رہا ہے۔ اردو کے بیشتر ناول نگاروں مثلاً سرشار، شرر، منشی پریم چند اور حالیہ برسوں میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، کشمیری لال ذاکر اور دوسرے بہت سے فن کاروں کے ناول عرصہ دراز تک اخبارات اور رسایل میں قسط وار چھپتے رہے ہیں۔ اودھ اخبار، اودھ پنچ، دلگداز، جیسے رسایل سے لے کر شاعر، آج کل، بیسویں صدی، نقوش، شاہراہ اور افکار تک کتنے ہی رسایل نے کتنے ہی ناولوں کو کتابی صورت میں شایع ہونے سے قبل اپنے دامن میں

سمیٹ لیا ہے اور تواور منشی پریم چند کا پہلا ناول اسرار معابد بنارس کے ایک معمولی ہفت روزہ اخبار "آوازۂ خلق" میں ۸۔ اکتوبر ۱۹۰۳ء سے یکم فروری ۱۹۰۴ء تک قسط وار شائع ہوتا رہا تھا۔ ہمارے فن کار اس وقت اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے جب جموں خطے سے ریاست کا پہلا اخبار "رنبیر" شائع ہونے لگا۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع میں سب سے پہلے ناول نگاری کی شروعات پنڈت سالگرام سالک اور مولوی محمد الدین فوق نے کی۔ سالگرام سالک نے "داستان جگت روپ" اور "تحفۂ سالک" تصنیف کر کے نثر کے اس شعبے کی طرف توجہ کی۔ اگرچہ یہ تصانیف قطعی طور پر ناول کے زمرے میں شامل نہیں کی جا سکتیں۔ لیکن ان میں قصے کی مہک ہے۔ داستان جگت روپ ناول سے زیادہ ایک داستان ہے اور اس میں پلاٹ در پلاٹ کی تکنیک کا التزام کیا گیا ہے اور کئی مقامات پر فوق الفطری عناصر کی کار فرمائی بھی نظر آتی ہے۔ لیکن اس سے قبل ہمارے یہاں اس طرح کا کوئی نثری کارنامہ نظر نہیں آتا۔ اس قصے سے قطع نظر سالک نے "تحفۂ سالک" ڈپٹی نذیر احمد کے مراۃ العروس کے تتبع میں لکھا جس میں قصے کے پیرائے میں مختلف ممالک کے سمندری سفر کا ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے سندباد اپنے سفر کی روداد سنا رہا ہو۔ اس سے بہتر کوشش مولوی محمد الدین فوق کے یہاں ملتی ہیں۔ فوق کی تصانیف ایک سو کے لگ بھگ ہیں۔ ان میں ان کے نثری کارنامے بھی شامل ہیں۔ نثری کارناموں میں کئی تاریخی اور نیم تاریخی قصے بھی ہیں۔ ان میں سے بعض قصوں پر ناول نگاری کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ فوق خود اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان کے قصوں میں خاص طور پر "اکبر"

اور "انار کلی" نام کے دو تاریخی قصے ہیں۔ جن کو ہم بیسویں صدی کے اولین ناول کہہ سکتے ہیں جو اردو میں لکھے گئے اور ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلے جس کا تعلق جموں و کشمیر سے تھا۔ فوق کا ناول انار کلی ۱۹۰۰ء میں لاہور سے شایع ہوا۔ یہ تاریخی ناول ہے۔ اس کے دیباچے میں مصنف نے لکھا ہے کہ اس ناول کا پلاٹ فرضی نہیں بلکہ اوریجنل ہے اور اکثر تواریخیں اس کی شاہد ہیں۔ اس کا پلاٹ ان کے ایک دوست نے چند انگریزی تواریخوں اور دیگر ذرایع سے انتخاب کر کے ان کو ناول لکھنے پر آمادہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ابھی امتیاز علی تاج نے اپنا شہرہ آفاق ڈراما " انار کلی" نہیں لکھا تھا۔

فوق نے کئی اور ناول لکھے۔ ان میں ناکام، ناصح مشفق، عزیب الدیار، نیم حکیم اور اکبر قابل ذکر ہیں۔ اکبر تاریخی ناولوں میں درجہ امتیاز رکھتا ہے کیونکہ اس میں واقعات نسبتاً مستند ہیں۔ یہ ناول انار کلی کے دس سال بعد ۱۹۰۹ء میں لاہور سے ہی شایع ہوا۔ فوق کو اس بات کا یقین تھا کہ یہ ناول دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ کیونکہ لوگوں کو قدیم غیر حقیقی باتوں اور جنسی معاملات سے دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے خود اس ناول کے دیباچے میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایسی کتابیں جو ملکی اور قومی بہبودی کے خیالات لے کر نکلے گی وہ دلوں میں جگہ بنائے گی یہ وہی زمانہ تھا جب منشی پریم چند (جو اس زمانے میں نواب رائے کے نام سے لکھتے تھے) نے اپنے اولین افسانوی مجموعے سوز وطن کے دیباچے میں اور باتوں کے علاوہ لکھا تھا:۔

" ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت
ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب وطن کی عظمت
کا نقش جمائیں"۔

یہاں اس بات کے اظہار میں تامل نہیں کہ یہ اردو ناول کا ابتدائی دور تھا۔ اور ہمارے سامنے چند مستثنات کے بغیر کوئی قابل قدر ناول نہیں لکھا گیا تھا۔ جو مغربی معیار کے مطابق ناول کی مخصوص تکنیک پر پورا اترتا۔ یہ بات پہلے ہی صاف ہو چکی ہے کہ ریاست جموں وکشمیر سے کسی اخبار کی عدم اشاعت بھی ادب کے مختلف شعبوں کی طرف عدم توجہی کا ایک بڑا سبب بنی لیکن جب جموں خطے سے ہفت روزہ "رنبیر" شایع ہونے لگا تو کئی لوگوں نے لکھنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ ناول جیسی صنف کی طرف بھی توجہ ہوئی اور اس اخبار کی مختلف اشاعتوں میں اپنے ناول قسط وار چھپوانا شروع کیے۔ اس دور کے لکھنے والوں میں وشوا ناتھ ورماہ، موہن لال ماروا، شمبھو ناتھ ناظر اور کئی نام قابل ذکر ہیں۔ اسی دوران پنڈت نند لال در بے غرض نے اپنا ناول "تازیانہ عبرت" کے عنوان سے لکھا۔ جس کے کچھ حصے بعد میں مقامی اخبارات میں شایع ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صوبہ کشمیر سے بھی اخبارات نکلنا شروع ہوئے تھے اور "وتستا" "ہمدرد" اور "مارتنڈ" نے اپنی ایک ساکھ قائم کر لی تھی اور اس طرح سے ہماری صحافی روایات کا آغاز ہوا تھا۔ بے غرض کا یہ ناول رتن ناتھ سرشار کے ضخیم ناول فسانۂ آزاد کے تتبع میں لکھا گیا ہے اور اس میں آغاز سے انجام تک فسانۂ آزاد ہی کی طرح داستانی فضا کی چھاپ ہے۔

۱۹۴۷ء سے قبل پریم ناتھ پردیسی نے افسانہ نگاری کے علاوہ ناول کو بھی اپنی جولاں گاہ بنایا۔ انہوں نے ایک بھرپور ناول پوتی کے عنوان سے لکھا لیکن قبل اس کے کہ اس ناول کا کوئی حصہ شایع ہوتا۔ انہوں نے یہ مسودہ لاہور کے ایک پبلشر "ناجو" کو بھیج دیا تھا۔ جنہوں نے قومی کتب خانہ لاہور سے

اسے شایع بھی کیا تھا۔ لیکن تقسیم کے دوران تلف ہوا۔ اس طرح سے ہم ایک اچھے ناول کے مطالعے سے محروم رہے۔ جسکی توقع پریم ناتھ پردیسی جیسے قلم کار سے ہوسکتی تھی۔ اس دور کا سب سے اہم ناول "اور انسان مرگیا ہے" جو مشہور فکشن رائیٹر اور آج کل کے نامور فلم ساز راما نند ساگر کے قلم سے نکلا۔ فسادات کے موضوع پر لکھا ہوا یہ ناول کافی متنازعہ فیہ رہا اور ایک عرصے تک پورے برصغیر کے ادبی حلقوں میں موضوع بحث رہا۔ راما نند ساگر نے ابتدا میں یہ ناول "فساد اور امن" کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ ناول انتہائی ذہنی اور جذباتی خلفشار کے دوران ایک ہنگامی موضوع پر لکھا گیا ہے۔ جس کی بنیاد فرقہ وارانہ فسادات ہیں۔ اگرچہ ناول کے پلاٹ میں نظم و ضبط نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی ساگر نے انسان دوستی اور درد و خلوص کے ساتھ اس ناول کو لکھا ہے۔ اس ناول کی بنیاد ساگر کے وہ نوٹس ہیں جو انہوں نے اس خون آشام کے دوران اکٹھا کر لئے تھے۔ جب بھائی بھائی کا دشمن تھا اور انہیں سرزمین کشمیر میں بیٹھ کر مکمل کرلیا۔ خواجہ احمد عباس نے اس کے پیش لفظ میں ساگر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"یہ ہنگامی لٹریچر نہیں ایک کلاسیک ہے۔
اس کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ مرتی ہوئی
انسانیت کی صدائے بازگشت ہے.....
.......اس میں آپ خوب پہچان لیں گے
کہ انسانیت کی مرنے کے بعد شکل کیا ہوجاتی
ہے۔"

یہ کہنا شاید بے جا نہیں ہوگا کہ اگرچہ راما نند ساگر اب ریاست سے باہر بمبئی میں مستقل طور پر اقامت پذیر ہیں۔ لیکن ان کا تعلق سرزمین کشمیر سے ہے۔ وہ یہیں

پیدا ہوئے۔ اور یہیں پروان چڑھے۔ ان کی ابتدائی کہانیوں میں اسی سرزمین کی رنگ و بو کا احساس ہوتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد نثر کے اس شعبے میں خاصی پیش رفت ہوئی۔ نئی نسل سے تعلق رکھنے والے نوجوان فن کاروں نے کئی قابل قدر ناول لکھے۔ بزرگوں میں نرسنگھ داس نرگس کا نام سرفہرست ہے۔ نرگس ۱۹۴۷ء سے قبل کی پیداوار ہیں۔ وہ ایک قابل صحافی بلند مرتبہ ادیب افسانہ نگار اور ناول نگار تھے۔ انہوں نے اپنا اخبار چاند جموں سے جاری کیا تھا۔ چاند نے ادب کے میدان میں کئی معرکے انجام دیئے۔ اس کی مختلف اشاعتوں میں شعر و ادب کے گہر پارے شایع ہوتے تھے۔ نرگس کئی ناموں سے لکھتے تھے۔ وہ عرصہ دراز تک مولا رام کوٹی اور پریم منوہر کے ناموں سے لکھتے رہے۔ انہوں نے کئی ناول بھی لکھے۔ ان کے اچھے ناولوں میں "پاربتی" اور "نرملا" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ افسانوں ہی کی طرح انہوں نے اپنے ناولوں میں سماجی مسایل کو اپنا موضوع بنایا اور سماج کی بدعتوں کی تصویر کشی کی۔ نرگس خاص طور پر دیہاتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ انہوں نے چونکہ عمر عزیز کا بیشتر حصہ دیہاتوں میں گزارا ہے۔ اس لئے ان کے ناولوں میں دیہاتوں کے مٹی کی مہک ہے۔ وہ اندھ وشواس کے خلاف ہیں۔ اسلئے ان کے ناولوں کے کردار ایسے لوگ ہیں جو رسم و رواج کی چوکھٹ پر قربان ہونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ اسی اندرد کو پیش کرتے ہوئے نرگس اپنے ناولوں میں اپنے اصلاحی مقصد کو پیش کرتے ہیں۔

اس دوران خطۂ کشمیر کے ایک نوجوان کاشی ناتھ ترجہیل خوشتر نے "گوری شنکر" عنوان سے ایک ناول شایع کیا۔ خوشتر اپنے وقت کے معروف ادیب اور

شاعر تارا چند ترجھل سالک کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے شعر و ادب کا ذوق لطیف انہیں ورثے میں ملا تھا۔ یہ ناول اپنی مبتدیانہ خامیوں کے باوصف ایک اچھی کوشش تھی۔ افسوس خوشتر کا انتقال عین نوجوانی میں ہوا اور ہم ایک اچھے ناول نگار سے محروم رہ گئے۔

نرسنگھ داس نرگس کے ہم عصروں میں کشمیری لال ذاکر اور ٹھاکر پونچھی کے نام اہم ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں سن و سال کے اعتبار سے نرگس سے کم عمر تھے لیکن دونوں نے ۱۹۴۷ء سے قبل لکھنا شروع کیا تھا۔ اور ایک کے بعد ایک ناول تخلیق کیے۔ ذاکر صاحب بفضل اللہ ابھی حیات ہیں اور مسلسل بے تکان لکھے جا رہے ہیں۔ لیکن ٹھاکر پونچھی ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ ذاکر نے ایک بہت ہی چھوٹے ناولٹ "سیندور کی راکھ" سے ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا اور "سمندر، صلیب اور وہ" تک یکے بعد دیگرے کئی ناول لکھے۔ ان کے اہم ناولوں میں انگوٹھے کا نشان، دھرتی سدا سہاگن، کرماں والی، لمحوں میں بکھری زندگی، جاتی ہوئی رت، خون پھر خون ہے، ڈوبتے سورج کی کتھا، چھٹی کا دودھ، چار میل لمبی سڑک، میں اسے پہچانتی ہوں وغیرہ ہیں۔

ان میں سے کئی ناول کشمیر کے پس منظر میں ہیں۔ ذاکر کا فکشن ہیئت کے نئے تجربوں کے باعث نہیں اپنے متنوع موضوعات کے لئے بھی اہم ہیں۔ ان کے ناولوں میں انسانی زندگی کے بیکل باطن کی بے چینی کا شدید احساس ہوتا ہے اور ہمارے سماج اور معاشرے کی وہ بدصورتی بھی جس نے غم اور ملال کا زہر گھول دیا ہے کھل کر بے نقاب ہو جاتی ہے۔ ذاکر کے ناولوں میں عجیب و غریب موضوعات کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً ان کا ناول "ڈوبتے سورج کی کتھا" اردو میں اس لحاظ سے منفرد اور واحد ناول

ہے جو AGING یعنی ڈھلتی ہوئی عمر پر مرکوز کیا گیا ہے۔ "سمندر صلیب اور وہ" بظاہر
گوا کی تحریک آزادی کا احاطہ کرتا ہے لیکن اُسے کشمیر کے پس منظر میں پیش کیا گیا
ہے۔ اس طرح سے اس میں بھی ایک ندرت آگئی ہے۔ "خون پھر خون ہے"
اردو کا واحد ناول ہے جو ایمرجنسی کے دوران ہی ایمرجنسی پر لکھا گیا ہے۔ "جاگتی
ہوئی رُت" میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت مرد کی بالادستی والے
سماج میں کس طرح دوسرے درجے کی شہری مانی جاتی ہے۔ "کرماں والی" کا موضوع
ایک مسلمان عورت ہے جس کا بچہ سکھ گرنتھی کے ہاتھوں پلتا ہے۔ اس پر
تبصرہ کرتے ہوئے خواجہ احمد عباس نے لکھا تھا کہ:

> "گزشتہ دس سالوں میں ایسا ناول نہیں
> لکھا گیا ہے۔"

ذاکر کا تخلیقی سفر جاری ہے اور ان کے کئی ناول ابھی سامنے آرہے ہیں۔

کشمیری لال ذاکر کے ساتھ ان کے قریبی ہم عصر ٹھاکر پونچھی کا نام لیا جا سکتا
ہے جو بحیثیت افسانہ نگار کسی زمانے میں بڑے معروف تھے لیکن ٹھاکر کو شہرت
ان کے ناولوں سے ملی اور ان کی فنی صلاحیت کا اندازہ ان کے ناولوں سے
ہی ہوتا ہے۔ انہوں نے اردو ادب کو "رات کے گھونگھٹ"، "وادیاں اور ویرانے"
"شمع ہر رنگ میں جلتی ہے"، "سحر ہونے تک"، "پیاسے بادل"، "یادوں کے کھنڈر"،
"زلف کے سر ہونے تک"، "چاندنی کے سائے"، "اب میں وہاں نہیں رہتا" جیسے
متعدد اور اہم ناول دیئے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ٹھاکر پونچھی بنیادی طور
پر ناول نگار ہی تھے اور اگر ان کی زندگی یارا کرتی تو وہ اردو ادب کو اپنے
خوبصورت ناولوں سے مالا مال کرتے۔ ٹھاکر پونچھی کے ناولوں میں ایک
طرف ترقی پسندی کے رجحانات کار فرما ہیں اور دوسری طرف ڈوگرہ طرز زندگی

کی حقیقت آمیز تصویریں بھی ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ نئی اور پرانی قدروں کے درمیان کشمکش اور تضاد سیاسی سماجی اور مذہبی استحصال کرنے والی قوتوں کے خلاف احتجاج اور دیہاتی اور شہری تفاوت ان کے خاص موضوعات ہیں جن پر انہوں نے کھل کر لکھا ہے۔ ٹھاکر پونچھی اور کشمیری لال ذاکر نے جیسا کہ ذکر ہوا اردو دنیا میں ناول نگاری کے فن سے ہی اپنی پہچان منوالی ہے۔ دونوں کی شہرت ۱۹۴۷ء کے بعد ہوئی۔ ٹھاکر پونچھی کی افسانہ نگاری اور ناول نگاری مقبول ماہنامہ "بیسویں صدی" کے صفحات پر نکھری۔ جس میں ان کے بے شمار افسانے اور ناول قسط وار شائع ہوتے رہے۔

۱۹۶۰ء کے بعد ریاست جموں و کشمیر میں افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ناول نگاری کی طرف بھی خاص توجہ ہوئی اور کئی نام ابھرے۔ ان میں سے چند معزز مستثنات کے سوائے زیادہ تر فن کار نئی نسل کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور عصر حاضر کے تقاضوں کی عکاسی اپنے ناولوں میں کرتے ہیں' ان کے یہاں وہ گھن گھرج نہیں ملتی جو ترقی پسند ناول نگاروں کا طرۂ امتیاز رہے اور وہ فارمولائی پلاٹ بھی نہیں ملتے جن کا تعلق گہرے طور پر دور گزشتہ سے رہا ہے۔ اب ایسے ادب کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی جس میں خالی خولی جذباتیت یا نعرہ بازی موجود ہو۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اب استحصال اور لوٹ کھسوٹ کے معاشرے کی بے راہ روی ہمارے ناول نگاروں کا موضوع نہیں بنتا۔ اس سلسلے میں ہمارے قابل ذکر ناول نگار تیج بہادر بھان ہیں۔ تیج بہادر بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور جہلم کے سینے پر اور عورت جیسے افسانوی مجموعوں سے یہاں کے ادبی حلقوں میں اپنی ساکھ بنا چکے ہیں۔

"سیلاب اور قطرے" کے عنوان سے ان کا ناول کئی برس قبل شائع

ہوا۔ یہ ناول جھیل ولر کے پس منظر میں ایک غریب سنگھاڑے جمع کرنے والے خاندان کی زندگی کی روداد ہے۔ جس میں نہایت ہی حقیقت پسندانہ انداز اختیار کیا گیا ہے جو اسے اپنے معاصرین ناول نگاروں سے ممیز کرتی ہے۔ رتیبج کی ایک بڑی خصوصیت جو اس ناول کے تناظر میں سامنے آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ ترقی پسند ہوتے ہوئے جذباتی طور پر ترقی پسندی کی کھوکھلی جذباتیت اور نعرہ بازی کے شکار نہیں ہوئے ہیں۔ وہ تہہ در تہہ چھپی ہوئی انسانی نفسیات کی پرتوں کے اندر بہت دور تک چلے گئے ہیں اور بڑی ہی دروں بینی کے ساتھ کئی بہت ہی نازک نفسیاتی نقطے کھوج نکالے ہیں۔ تیبج کا انداز بیان کہیں پر بھی ڈگمگاتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ناول کا بنیادی موضوع اگرچہ افلاس اور استحصال کی ماری ہوئی انسانی زندگی ہے۔ جسے سیلاب کے پس منظر میں ابھارا گیا ہے۔ تیبج نے سرکاری اہلکار ہوتے ہوئے بڑی بے رحمی اور بے باکی کے ساتھ نوکر شاہی اور سرکاری استحصالی نظام کی دھجیاں اڑادی ہیں۔ جو ایک بڑی بات ہے اور انہیں بڑا حقیقت پسند بناتی ہے۔ تیبج بہادر بھان کے اکثر ناقدین نے ان کے زبان کے برتاؤ کے لئے انہیں ہدف ملامت بنایا ہے۔ اس ناول میں اگرچہ ان کے افسانوں کے مقابلے میں بہتر زبان ملتی ہے لیکن بعض مقامات پر ان کا لہجہ کھردرا اور نامانوس محسوس ہوتا ہے۔ تیبج کے پاس اگر بہتر اسلوب ہوتا تو ان کے فن میں مزید نکھرنے کے امکانات موجود تھے۔

غلام رسول سنتوش ہماری ثقافتی زندگی کی ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ بنیادی طور پر وہ مصور ہیں وہ کشمیری اور اردو میں شعر بھی کہتے ہیں۔ اردو میں چند کہانیوں کے علاوہ انہوں نے ایک ناول "سمندر پیاسا ہے" بھی پیش کیا ہے۔ یہ

ناول بیانیہ انداز میں ہوتے ہوئے بھی کہیں کہیں چشمہ شعور کی تکنیک کا احساس دلاتا ہے۔ اس ناول کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ سنتوش بھی انسان کے دروں میں اتر کر اس کے اندر چھپے ہوئے نفسیاتی پیچ تلاش کر کے اس کے اندر کے حیوان کی درندگی کو بے نقاب کرتے ہیں۔ یہ خصوصیت اردو کے بہت کم ناولوں میں ملتی ہے۔ سنتوش کے یہاں ایک اچھے اور منجھے ہوئے ناول نگار کے امکانات نظر آتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اس کے بعد اور کوئی ناول نہیں لکھا۔

علی محمد لون ہماری ریاست کے بہت اچھے ڈراما نگار اور افسانہ نگار ہوئے ہیں۔ ان کا نام بحیثیت افسانہ نگار کے بھی پوری اردو دنیا میں معروف ہے وہ ایک زمانے میں ناول کی طرف بھی متوجہ ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا واحد ناول "شاید ہے آرزو تیری" لکھا۔ اس ناول کا کینواس دہلی شہر ہے لون نے کشمیر سے گزر کر دہلی کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس ناول میں دہلی کے مخصوص طبقے کے معاشرے کو قریب سے دیکھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں ایک کشمیری نوجوان حوادث زمانہ کا شکار ہو کر اس معاشرے کے تھپیڑوں میں اپنی زندگی کے زرین لمحات گزارتا ہے اور اس میں بہہ جاتا ہے۔ لون اگرچہ عملی طور پر ترقی پسند تحریک کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔ لیکن ان کے ناول میں کہیں پر بھی کسی طرح کی جذباتی اور فارمولائی یا سکہ بند میلان کا احساس نہیں ہوتا۔

پروفیسر حامدی شروع میں ترقی پسند تحریک کے ساتھ رسمی طور پر وابستہ تھے۔ اس لیئے ان کے یہاں ترقی پسند تحریک کا غیر واضح اثر نظر آتا ہے لیکن اس تحریک سے کوئی ذہنی وابستگی پیدا نہ ہونے کے باعث وہ اپنے فن میں

کوئی نظریاتی بنیادیں قایم نہ کر سکے۔ اس کے برعکس ان کے ناولوں میں آس پاس
کی زندگی کا اثر تو ملتا ہے لیکن وہ حد درجہ رومانی ہے۔ لیکن کئی برس کے بعد
انہوں نے اس راہ کو ترک کر کے شخصی تجربات کو نثر کے مختلف وسایل سے
منوانے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ ان کے ذہن میں
پختگی پیدا ہوتی گئی۔ مطالعے اور مشاہدے کی گہرائی نے انہیں سماجی اقدار کی پامالی
کا احساس دلایا اور رشتوں کی شکست وریخت اور دوہری شکست کی نفسیات
ان کے محبوب موضوع بن گئے۔ چنانچہ بہاروں میں شعلے، بلندیوں کے خواب،
اور برف میں آگ کی رومانیت سے نکل کر وہ پرچھائیوں کا شہر جیسا ناولٹ
لکھنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ ان کے تخلیقی سفر کا ایک اہم موڑ تھا۔ اس میں وہ
داخلیت کے پیچیدہ مسایل اور اندرون کی شناخت کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے
ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر قاری نادیدہ دنیاوں میں کھو سا جاتا ہے اور جامدی
کے تخلیقی تجربے کی نئی جہت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ناولٹ فکشن میں ان کا بہت
ہی قابل قدر تجربہ ہے۔

دوسرے ناول نگاروں میں نور شاہ (پایل کے زخم، نیلی جھیل کالے سائے)
مدن موہن شرما (ایک منزل چار راستے) مالک رام آنند (دہکتے پھول شبنم آنکھیں،
اپنے وطن میں اجنبی، نئے دل پرانے سال) کرن کاشمیری (خوابوں کے قافلے،
رات اور زلف) صوفی محی الدین (بکھر گئے سب تنکے) فاروق رینزو (زخموں کی
سالگرہ) ڈی کے کنول (کشمکش، تماشا، نیا سفر) شبنم قیوم (یہ کس کا لہو کون مرا،
چراغ کا اندھیرا، پرانی ڈگر نئے قدم، جس دیش میں جہلم بہتی ہے) آنند لہر
(تیسوی کون) جان محمد آزاد (وادیاں بلا رہی ہیں، کشمیر جھاگ اٹھا) بھوشن لال
بھوشن (صرف پانچ ہزار) وجے سوری (ایک ناو کاغذ کی) وغیرہ خاص طور

پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام ناول نگاروں کا امتیاز ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے انداز میں اپنے عہد کے کرب کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ ۱۹۶۰ کے فوراً بعد جن ناول نگاروں نے ناول لکھے۔ وہ ابھی مکمل طور سے ترقی پسندی کے جادوئی اثر سے باہر نہیں آسکے ہیں۔ اسلئے ان کے یہاں اقتصادی اور سیاسی نظام کے خلاف بغاوت کے اثرات بالکل ہی مٹ نہیں سکے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگوں نے تکنیک کے نئے تجربے بھی کئے۔ ان میں خاص طور پر مالک رام آنند کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جن کے ناول " اپنے وطن میں اجنبی " میں چشمۂ شعور کی تکنیک کا التزام کیا گیا ہے۔ نور شاہ، غلام رسول سنتوش حامدی کاشمیری، کرن کاشمیری، ڈلی کے کنول اور جان محمد آزاد کا انداز رومانی اور شاعرانہ ہے۔ حامدی کاشمیری اور جان محمد آزاد کو زبان پر بے پناہ گرفت حاصل ہے۔ نئے لکھنے والوں میں آنند لہر کا تپسوی کون بطور خاص ذکر کے قابل ہے۔ آنند لہر اگرچہ جدیدیت سے متاثر ہیں۔ لیکن اس ناول میں انہوں نے قدیم و جدید کے امتزاج سے اپنے ناول کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ انہوں نے معاصر سماج کے بہت ہی حساس اور پیچیدہ مسایل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اور آج کی زندگی میں جدید تر انسان کے رویے کا موثر اظہار کیا ہے۔ حامدی کاشمیری نے اگرچہ اب فکشن کی طرف اپنی توجہ کم کردہ ہے۔ لیکن شروع میں وہ ایک کہانی کار اور ناول نگار کی حیثیت سے کافی معروف رہے۔ ان کے موضوعات اور ان کا ٹریٹمنٹ سرتاسر رومانی تھا لیکن ناولٹ پرچھائیوں کا شہر ان کے تخلیقی سفر کا ایک اہم موڑ تھا۔ اگر وہ اپنی انداز میں اپنے متنوع موضوعات کا احاطہ کرتے۔ تو آج ہمارے ناول نگاروں میں وہ صف اول میں نظر آتے۔

آج ہمارے ناول نگاروں کو اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ ناول محض قصہ گوئی کا یا داستان طرازی کا دوسرا نام نہیں بلکہ یہ انسانی زندگی کی خوشیوں اور تلخیوں اس کے غموں اور شادمانیوں کی تصویر پیش کرنے کا ایک بڑا وسیلہ ہے۔ آج کی بدلتی ہوئی زندگی میں وہ ایک بدلے ہوئے ردعمل کا اظہار بھی ناول کے فارم میں کرتا ہے۔ آج ہمارا ناول نگار نہ مبلغ ہے۔ اور نہ سیاست دان اور نہ ہی خطیب۔ وہ خود آگاہ اور خود شناس بن گیا ہے۔ اسے اپنی 'بے کسی' اور لاچاری اور بے بسی نے حد درجہ بے چین اور مضطرب بنایا ہے۔ وہ صرف خارجی طور پر ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ اپنی روح میں اتر کر اپنی تنہائی کی غواصی کرتا ہے۔ اور قطرہ قطرہ اپنے لہو کو سمیٹ لیتا ہے۔ اور خارجی زندگی کے مشاہدے کو باطن کی دہکتی ہوئی بھٹی پر چڑھاتا ہے۔ اور پھر یہی سچائی قلم کی نوک سے کاغذ پر آجاتی ہے۔ اس میں قلم کار کو کن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ اس کے تخلیقی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ آج کے پیچیدہ زمانے میں ناول نگار کے تجربے بھی پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ اس لئے اس کے ناول کی ہئیت بھی پیچیدہ شکل اختیار کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج کے ناول میں بسا اوقات ناول نگار کے احساسات بکھرے بکھرے اور بے ترتیب سے نظر آتے ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر کے جدید تر ناول نگاروں کے بیشتر ناولوں میں مجھے اسی بے چینی اور بے کلی کا احساس ہوا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کے ناول نگاروں نے ہر عہد میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق ان مسایل کو ناول کے قالب میں پیش کیا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے لکھنے والے ناول نگاروں کا انداز روایتی تھا اور اس میں داستانی روایت کے اثرات نظر آتے ہیں۔ لیکن نئی نسل کے ناول نگاروں نے

صرف عصری سیاست یا عصری سماجی مسایل کو اپنا موضوع خاص نہیں بنایا بلکہ اس روح کے درد کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ جو آج کے انسان کی تقدیر ہے وہ مقامیت سے ماورا ہو گیا ہے۔ وہ جغرافیائی حصاروں سے بلند ہو کر ازلی اور ابدی انسان کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ کرداروں، مکالموں، واقعات اور بیانات کے سہارے سے ایک کلی تاثر پیدا کرتا ہے۔ اور اسی کو اپنے فن کی تمام آنچ سے پختہ بناتا ہے۔ آج ہمارے ناول نگار محض روایت پرست نہیں ہیں اور نہ ہی دوسروں کی اندھا دھند تقلید کرنے سے اپنے فرائض سے عہدہ برا ہوتے ہیں بلکہ ان کے یہاں موضوعات اور اسالیب کے کئی رنگ ملتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ مقدار کے اعتبار سے ناول کی صنف میں ہمارے کارنامے قلیل ہیں لیکن ادھر ۱۹۶۰ء کے بعد اس میدان میں جو کارنامے انجام دیئے گئے ہیں اور دیے جا رہے ہیں۔ وہ معیار کے اعتبار سے مایوس کرنے والے نہیں ہیں۔ ۞

ـــــــــــــــ

# جموں وکشمیر میں صحافت

صحافت بنیادی طور پر نثر کا ہی ایک طاقتور شعبہ ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں اردو نثر کی باضابطہ شروعات انیسویں صدی کے اواخر میں اس وقت ہوئی جب اس زبان کی مقبولیت کے زیر اثر مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۸۷۹ء میں اسے سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس زمانہ تک آتے آتے اردو خواندہ لوگوں کا حلقہ بڑھ چکا تھا اور اس حلقے میں اس زبان کو ذریعۂ اظہار کا درجہ حاصل تھا۔ سرکاری سرپرستی حاصل ہونے کے بعد یہ زبان ریاست کی سماجی اور سیاسی زندگی میں موثر رول ادا کرنے لگی۔ چنانچہ تعلیمی اداروں، سرکاری محکموں اور عدلیہ میں اسکے برتے جانے سے نہ صرف زبان میں وسعت پیدا ہوئی بلکہ اسکی اہمیت میں بھی اضافہ ہوا۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو شعروادب کی ترویج اور توسیع میں اخبارات اور رسائل کا سب سے زیادہ حصہ رہا ہے۔ ریاستی باشندوں نے وقتاً فوقتاً

اردو کے سرکاری زبان بننے کے بعد سرکار کی اجازت سے اخبار جاری کرنے کی متعدد بار کوشش کی لیکن انہیں ہر بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ریاست میں چھاپہ خانوں کا آغاز بہت پہلے ۱۸۵۸ء میں ہوا تھا۔ سب سے پہلا پریس احمدی پریس تھا۔ جس کے کئی سال بعد وکرم ولاس پریس کے نام سے ایک سرکاری پریس لگایا گیا۔ جس نے شروع شروع میں اردو زبان کی ترویج میں مدد کی تھی۔ لیکن اس زمانے میں کوئی اخبار شائع نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن ادھر اردو کی مقبولیت میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں ایک اردو اخبار نکالنے کی کوشش ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانے تک جاری رہا لیکن یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ اس لئے بعض کشمیری نژاد ہندوؤں اور مسلمانوں نے ریاست سے باہر ہندوستان کے مختلف شہروں سے باہر اخبارات جاری کئے۔ ان اخباروں میں علاوہ دوسری چیزوں کے خصوصی طور پر ریاست جموں و کشمیر کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسایل کے لیے چند کالم وقف تھے۔ ان میں سے چند اخباروں کے نام یہ ہیں :-

| | | |
|---|---|---|
| • مراسلہ کشمیر | (لاہور) | ۱۸۷۲ء |
| • اخبار عام | (لاہور) | ۱۸۸۱ء |
| • خیر خواہ کشمیر | (لاہور) | ۱۸۸۲ء |
| • ہمدرد ہند | (لاہور) | ۱۸۹۴ء |
| • کشمیر درپن | (الہ آباد) | ۱۸۹۸ء |
| • رسالہ کشمیر پرکاش | (لاہور) | ۱۸۹۸ء |
| • کشمیری پرکاش | (لاہور) | ۱۸۹۸ء |
| • پنجۂ فولاد | (لاہور) | ۱۹۰۱ء |

- کشمیر گزٹ (لاہور) ۱۹۰۱ء
- کشمیری میگزین (لاہور) ۱۹۰۱ء
- کشمیری مخزن (لاہور) ۱۹۰۵ء
- کشمیر میگزین (لاہور) ۱۹۰۶ء
- سفیر (لاہور) ۱۹۱۴ء
- صبح کشمیر (لاہور) ۱۹۱۶ء
- بہار کشمیر (لاہور) ۱۹۱۶ء
- کشمیر (امرتسر) ۱۹۲۴ء

ریاست سے ایک اردو اخبار نکالنے کی کوششیں بہت پہلے سے شروع ہوئی تھیں۔ ریاست کا پہلا اخبار "بدیا بلاس" خود مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اپنے دور حکومت میں جاری کیا تھا۔ یہ اردو اور ہندی دونوں حروف میں شائع ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی زمانے کے آس پاس منشی ہر سکھ رائے نام کے ایک شخص نے "تحفہ کشمیر" پریس کے نام سے اپنا ایک پریس لگوایا تھا اور اسی نام کا ایک اخبار بھی جاری کیا تھا اس لحاظ سے یہ صوبہ کشمیر کا پہلا اخبار تھا۔ لیکن زیادہ دن چل نہ سکا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اخبارات کے سلسلے میں زیادہ سختی سے کام لیا۔ اس کے زمانے میں کئی لوگوں نے اخبارات جاری کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے سب سے مستحسن کوشش سالگرام سالک کی تھی۔ جنہوں نے ۱۸۸۰ میں مہاراجہ کے حضور میں ایک اخبار نکالنے کی شدید خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن یہ درخواست مسترد ہوئی چنانچہ سالگرام سالک کشمیر سے ہجرت کر کے لاہور میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور یہاں سے انہوں نے خیر خواہ کشمیر کے نام سے اپنا ہفت روزہ جاری کیا اور اس اخبار کے ذریعہ اظہار خیال کرتے رہے۔ سالک کے بڑے

صحافی پنڈت ہرگوپال خستہ اپنے عہد کے بہت اچھے ادیب شاعر اور صحافی تھے وہ شبلی اور حالی کے معاصر تھے اور قیام لاہور کے دوران " راوی رلیفارمر" خیر خواہ کشمیر، دلیس کی پکار اور اس طرح کے کئی پرچوں کے ساتھ وابستہ رہ کر انہوں نے صحافت کا اعلیٰ تجربہ حاصل کیا تھا۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور حکومت میں بھی کشمیر سے اخبار نکالنے کی کئی کوششیں ہوئیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ تگ و دو مشہور مورخ ادیب اور صحافی محمد الدین فوق نے کی۔ ۱۹۰۴ء میں انہوں نے اس سلسلہ میں مہاراجہ کے سامنے عرضداشت پیش کی لیکن کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

محمد الدین فوق کی بڑی خواہش تھی کہ کشمیر سے ایک آزادانہ اخبار جاری ہو۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اس وقت کے ڈوگرہ حکمران مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو ایک عرضداشت پیش کی۔ انہوں نے علاوہ دوسری باتوں کے اس میں لکھا تھا کہ اس اخبار کو سیاسی اور ملکی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوگا اور ان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا جائے گا لیکن مہاراجہ نے اپنے ۱۰ر جون ۱۹۰۷ء کے مراسلہ کے ذریعہ فوق کی یہ درخواست رد کرتے ہوئے احکام صادر کئے تھے کہ موجودہ وقت میں اس اخبار کو کشمیر سے شایع کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ مہاراجہ نے ہائی کورٹ کو بھی ہدایت دی تھی کہ وہ آیندہ سے چھاپہ خانہ لگانے اور اخبار جاری کرنے سے متعلق ایک قانون کا مسودہ تیار کرے جس میں ایسی تمام پابندیاں درج کی جائیں جن پر اخبار جاری کرنے والوں کا کاربند رہنا ضروری تھا۔ مجبور ہو کر فوق مرحوم نے اپنی کوششیں لاہور تک ہی محدود رکھیں اور وہیں سے متعدد اخبارات جاری کئے۔ برسوں بعد جب اجازت ملی تو ۱۹۲۴ء میں "کشمیر جدید" کے نام سے اپنا اخبار جاری کیا۔ یہ اخبار صرف دو سال تک

جاری رہ سکا۔ یہ فوق کا آخری اخبار تھا۔

۱۱-۱۹۱۲ء کے دوران ماہوار اردو رسایل مہاجن بھارتی پتریکا اور ڈوگرہ گزٹ بالترتیب مہاجن سبھا اور ڈوگرہ سدھار سبھا جموں کے اہتمام سے شایع ہوئے ان اخبارات کو سرکار کی حمایت حاصل تھی اور اسطرح سے یہ عوام کے بجائے مہاراجہ کے مفادات کا تحفظ کرتے تھے۔ یہاں لداخ سے شایع ہونے والے اخبار "لاروا گس کی اگبار" (یعنی لداخ کا خبر نامہ) کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ اخبار لداخی زبان میں ایک مشنری سوسایٹی کی طرف سے شایع ہوتا تھا۔ اس اخبار کی اہمیت صرف اس قدر ہے کہ یہ دور افتادہ مقام سے شایع ہوتا تھا۔ اور اس میں پہلی بار لداخ کی خبریں شایع ہوتی تھیں اردو صحافت سے اس کا براہ راست تعلق نہیں تھا لیکن پوری صحافت کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

کشمیر میں صحافت کو فروغ دینے کے سلسلہ میں پنجاب کے مشہور اہل قلم اور صحافی منشی ہر سکھ رائے کا ذکر ہو چکا ہے۔ مدنظر رہے کہ انہوں نے کشمیر میں پریس لگانے کی ابتدائی کوششوں میں حصہ لیا اور تحفۂ کشمیر پریس لگوانے میں کامیاب ہوئے۔ ہر سکھ رائے نے ۱۸۶۷ء میں اسی نام کا ایک اخبار نکالنے کی مساعی بھی کی۔ اس لحاظ سے یہ صوبہ کشمیر کا پہلا اخبار تھا لیکن یہ کوشش بارآور ثابت نہ ہو سکی۔ لاہور اور ہندوستان کے دوسرے شہروں سے کشمیر کے تعلق سے خاص طور پر اردو کے اخبارات شایع کرنے کے پس پشت یہی جذبہ تھا کہ ایسے بہت سے لوگوں کی درخواستوں کو مسترد کیا گیا تھا جنہوں نے سرکار سے اخبار نکالنے کی اجازت مانگی تھی۔ ایسی اجازت نہ پاکر دوسرے شہروں میں پناہ لی گئی۔ حتےٰ کہ بعض اخبارات کشمیر میں مرتب ہوتے تھے اور ان کی اشاعت ریاست سے باہر

ہوتی تھی۔ پنڈت ہرگوپال کول خستہ اور ان کے بھائی پنڈت سالگرام سالک نے
پنجاب سے کشمیر آتے ہی مہاراجہ رنبیر سنگھ سے درخواست کی تھی کہ انہیں
ایک پریس قائم کرنے کی اجازت دی جائے اور ایک اخبار لگانے کی بھی اجازت
ملے لیکن ان کی درخواست کو بھی حسب سابقہ مسترد کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ انہوں نے لاہور میں مختلف اخبارات جاری کئے۔ ان میں خیر خواہ کشمیر، راوی،
بے نظیر، پبلک نیوز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ آخر کار یہ تمام کوششیں ۱۹۲۴ء میں رنگ
لائیں۔ یہ سہرا ریاست کے مشہور صحافی لالہ ملک راج صراف کے سر باندھا جاسکتا
ہے جن کی کوششوں سے اخبار "رنبیر" نے جنم پایا۔ "رنبیر" ہفتہ روزہ کی حیثیت
سے ۱۹۲۴ء کو منظر عام پر آیا۔ اس سے قبل ملک راج صراف نے ۱۹۲۱ء سے
متعدد بار اپنے پیشروؤں کی طرح مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے حضور میں کئی درخواستیں
پیش کیں لیکن ہر بار ان کی درخواست مسترد ہوئی تھیں۔ ملک راج صراف
نے اپنی کتاب FIFTY YEARS AS A JOURNALIST میں وہ پوری روداد
درج کی ہے کہ "رنبیر" کو جاری کرنے کے لئے ان کو کون سے ہفت خوان
طے کرنا پڑے ہیں۔ آخر مہاراجہ کی کونسل نے ان کی درخواست قبول کی اور مہاراجہ
کو وقت کے دھارے کے سامنے جھکنا پڑا اور رنبیر کو تجربے کے طور پر جاری
کرنے کے احکام صادر ہوئے اور ملک راج صراف سے کہا گیا کہ سرکار ان
کے اخبار کو جاری کرنے کی اجازت صرف اسلئے دے رہی ہے کہ اس بات کا
اندازہ لگایا جائے کہ ریاست کا ایک باشندہ اپنی عوامی ذمہ داریاں کیسے پوری
کرتا ہے چنانچہ اس حکم کے مطابق ملک راج صراف نے ۲۴ر جون ۱۹۲۴ء کو
ہفت روزہ "رنبیر" کا پہلا شمارہ شائع کیا۔ یہ اخبار ۱۹۴۶ء میں روزانہ ہوا
اور ۸ر مئی ۱۹۵۰ء کو اس کی اشاعت رک گئی۔ "رنبیر کے رول کو بارے میں

و بیشتر شبہ ظاہر کیا گیا ہے۔ حبیب کیفوی اپنی کتاب "کشمیر میں اردو" میں لکھتے ہیں:۔

"ہفت روزہ رنبیر کی پالیسی حکومت نواز تھی
البتہ حکومت پر کبھی کبھی بڑی نرمی سے تنقید
کر دیا کرتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ "رنبیر" نے ایک انقلابی رول ادا نہیں کیا۔ لیکن اس بات کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا۔ کہ رنبیر کو اشاعت کی اجازت مشروط طور پر دی گئی تھی۔ اخبار کے مالک کو واضح طور پر کابینہ کا یہ فیصلہ پہنچایا گیا تھا کہ یہ اخبار صرف صنعتی، اقتصادی، کاروباری، تعلیمی اور ایسے مسایل پر اظہار خیال کرے گا۔ جن سے ریاست کی صنعتی اور تعلیمی ترقی میں مدد ملے گی۔ ایسے سیاسی معاملات پر کچھ لکھنے سے احتراز کرے گا جن سے ریاست جموں وکشمیر اور برطانوی حکومت اور دوسری ریاستوں کے درمیان تعلقات خراب ہو جائیں۔ ملک راج صراف نے یہ کامیابی کئی ہفت خواں طے کر کے حاصل کر لی تھی اور وہ خواب جو ہر گوپال کول خستہ سالگرام سالک، محمد الدین فوق، اور دوسرے لوگوں نے دیکھا تھا پورا ہو گیا۔ غالباً اسی وجہ سے "رنبیر" شروع میں وہ رول ادا نہیں کر پایا جس کی اس سے توقع تھی اور جو ایک آزاد اور خود مختار اخبار کو کرنا چاہیئے۔ رنبیر کے اجرا کے بعد برسوں بعد تک ریاست سے کوئی اخبار نہیں نکل سکا۔ ایک صرف اخبار ہفتہ روزہ "پاسبان" تھا۔ جو جموں سے پی معراج الدین احمد کی ادارت میں شائع ہوا اور جو مسلمانوں کے حقوق کی ترجمانی کرتا رہا لیکن یہ اخبار بھی زیادہ دنوں تک چل نہ سکا۔ رنبیر کے اجرا کے بعد بھی پریس کی آزادی نہیں تھی اور نہ پلیٹ فارم کی آزادی تھی لہذا اس کے لئے لوگوں کو کافی جدوجہد کرنا پڑی۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے بعد عنان حکومت مہاراجہ ہری سنگھ کے ہاتھ

میں آگئی۔ مہاراجہ نے حکومت سنبھالتے ہی شروع شروع میں لوگوں کے دل جیت لینا شروع کر دیے۔ لیکن یہ محض ایک سراب تھا۔ مہاراجہ بہت جلد اپنے عوام دشمن اور نااہل مشیروں کے کہنے پر عوام سے لاتعلق ہو گیا اور اسکی مقبولیت ختم ہو گئی۔ ملک میں ناخواندگی بے روزگاری اور استحصال کی بدعت روز بروز بڑھنے لگی۔ اس کا شدید ردعمل لوگوں کے دلوں میں ایک جوالامکھی کی طرح دھکنے لگا۔ مہاراجہ کی عاقبت نااندیش سے اس زمانہ کے ریاستی وزیر خارجہ اور مہاراجہ کے سیاسی مشیر سرالبین بنیرجی نے ۱۹۲۹ء میں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا اور وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہوئے اور باتوں کے علاوہ مسٹر بینرجی نے جس صورت حال کو واضح کیا۔ وہ یہاں پر پریس کی عدم موجودگی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے استعفیٰ میں لکھا:۔

"سرکار اور عوام میں کوئی رابطہ نہیں ہے اور نہ انہیں اپنے شکایات پیش کرنے کے لئے کوئی مناسب موقع ملتا ہے۔ انتظامیہ کی مشینری کو سرے سے بدلنے کی ضرورت ہے۔ ریاست میں کوئی رائے عامہ نہیں ہے۔ پریس عنقا ہے اور تعمیری تنقید کے ذریعہ سے سرکار کے پاس استفادہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔"

اسی طرح ۱۹۳۱ء میں مڈلٹن کمشن کی رپورٹ میں درج کیا گیا کہ ریاستی مسلمانوں کی بے چینی کی ایک بڑی وجہ ہے کہ ریاست میں اخبار شائع نہیں ہوتا۔ اس دباؤ سے مجبور ہو کر پریس ایکٹ میں ترمیم ہوئی اور ۱۹۳۲ء سے باضابطہ طور پر اخبارات

کا اجرا ہوا حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء تک اخبارات کی تعداد ۸۴ تک پہنچ گئی ان میں اخبارات کے علاوہ معیاری رسالے بھی شامل ہیں۔ ان اخبارات کا تعلق مختلف سیاسی، نیم سیاسی یا غیر سیاسی جماعتوں یا افراد سے تھا۔ ان میں سے کئی اخبارات سہ روزہ، ہفت روزہ اور ماہوار تھے اور ان میں سے بیشتر اردو میں ہی چھپتے تھے۔

لالہ ملک راج صراف نے اپنے اخبار کے ساتھ ساتھ ایک پریس بھی کھولا تھا۔ یہیں سے انہوں نے ۱۹۲۴ء میں بچوں کے لئے ایک رسالہ "رتن" کا اجرا کیا۔ یہ اقدام فعال ثابت ہوا۔ اس رسالے نے ایک قلیل عرصہ میں ملک گیر شہرت حاصل کی۔ یہ رسالہ شمالی ہندوستان میں بچوں کے رسایل میں سب سے اہم مقام رکھتا تھا اور اس نے بچوں کے ادب کا ایک نیا معیار قائم کیا۔ لاہور کے ہفت روزہ "پھول" کے سوائے اس زمانہ میں "رتن" کا مد مقابل بچوں کا کوئی رسالہ نہیں تھا۔

"رنبیر" کے بعد برس ہا برس تک ریاست سے کوئی اخبار ماسوائے ایک آدھ کے جاری نہ ہو سکا۔ اس حبس میں لوگوں کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا واضح ثبوت مہاراجہ ہری سنگھ کے سیاسی مشیر سر البین بینرجی کا استعفیٰ ہے جس کا ذکر اوپر کی سطور میں آچکا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد عوامی دباؤ سے پریس ایکٹ میں تبدیلی آئی تو سب سے پہلا اخبار سرینگر سے پنڈت پریم ناتھ بزاز نے ۱۹۳۲ء میں "وتستا" کے نام سے جاری کیا۔ "وتستا" نے قلیل عرصہ میں کشمیر کی صحافتی زندگی میں ایک نیا دریچہ کھولا اور پنڈت "بزاز" نے بحیثیت ایک صحافی کے اپنا لوہا منوایا۔ اسکے تین سال بعد پنڈت بزاز اور شیخ محمد عبداللہ نے مشترکہ طور پر "ہمدرد" نام سے ایک نیا ہفت روزہ جاری کیا جو جولائی ۱۹۴۳ء میں روزنامہ ہوگیا۔ یہ پرچہ پریم ناتھ بزاز اور مولانا سعید مسعودی دونوں کی مشترکہ ادارت

میں شایع ہوتا تھا۔ "وتستا" اور اب "ہمدرد" کے ذریعے بزاز صاحب نے خصوصی طور پر اور انکے ساتھ مولانا سعید کی مساعی نے اردو صحافت کا ایک نیا معیار قایم کیا۔ اس معیار کو بلند تر کرنے کے لئے اس دور کے مقبول و معروف اور باصلاحیت فنکاروں شاعروں اور ادیبوں کا تعاون حاصل کیا گیا۔ "ہمدرد" کے ادبی ایڈیشن اس زمانہ کا قابل قدر صحافتی کارنامہ ہے۔ قطع نظر اس کے کہ سیاسی اور سماجی سطح پر ریاستی عوام کی کسمپرسی اور شخصی نظام کے استحصال کی روداد ان اخباروں میں شایع ہو کر ملک کے پڑھے لکھے لوگوں تک پہنچی۔ ان سے دو فایدے اور ہوئے۔ اولاً یہ کہ کشمیر میں اردو کی ترویج و اشاعت میں اضافہ ہوا۔ اور دوم یہ کہ یہاں بھی لوگوں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا موقعہ ملا۔ اور بعض ایسے قلم کار نمودار ہوئے جن کے قلم کی توانائیوں نے بعد میں ہندوپاک میں دھاک جما دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مہاراجہ ہری سنگھ کی شخصی حکومت کے خلاف کشمیر میں تحریک حریت کا آغاز ہوا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ "وتستا" اور اس کے بعد "ہمدرد" نے کافی عرصہ تک اس تحریک کی اپنے کالموں کے ذریعے بھرپور معاونت کی۔

کشمیری پنڈتوں کی تنظیم "یووک سبھا" کے زیر اہتمام مارتنڈ کے نام سے ایک روزنامہ جاری ہوا اسکے مدیر اپنے عہد کے مشہور قلم کار پنڈت کشپ بندھو تھے۔ جنہوں نے اپنے زوردار قلم سے صحافت کے اس معیار کی توسیع کی جس کی شروعات ریاست میں لالہ ملک راج صراف اور پنڈت پریم ناتھ بزاز نے کی تھی۔ کشپ بندھو کچھ عرصہ کے بعد اس اخبار سے علیحدہ ہوئے اور انہوں نے "کیسری" اور "دیش" کے نام سے ہفتہ وار اخبارات نکالے اور کشمیر میں اردو صحافت کو ایک نئی سمت دی۔ کشپ بندھو کی علیحدگی کے بعد "مارتنڈ" کی

ادارت پنڈت گاشہ لال کول بی' اے اور پھر پنڈت پریم ناتھ کنہ نے سنبھالی۔
پریم ناتھ کنہ کا زمانہ مارتنڈ کا سنہری دور تھا۔ اس دوران میں مارتنڈ نے صحافت کی بلندیوں کو چھولیا اور نہ صرف اپنے فرقے کی ترجمانی کی بلکہ ریاستی اور قومی سطح پر بھی اپنا منصب بہت اچھی طرح نبھایا۔ مارتنڈ نے اس صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے کے دوران ضخیم اور شاندار خاص نمبر جاری کئے۔ جنہوں نے شمالی ہندوستان کی اردو دنیا میں دھوم مچادی۔ یہ اخبار برسوں تک تاریخ ساز رول ادا کرنے کے بعد اب انگریزی میں چھپ رہا ہے۔" دلیش" کو بلند معیار عطا کرنے میں مشہور ادیب گنگا دھر بٹ دیہاتی کی مساعی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ دیہاتی، کشپ بندھو کے نقش قدم پر چلنے والے ایک باصلاحیت ادیب اور کہانی کار تھے۔ اس زمانے کے تیسرے دہے کے آغاز میں ایک کشمیری زبان کے اخبار کی ضرورت محسوس کی گئی۔ چنانچہ "گاشہ" کے نام سے ایک اخبار شروع کیا گیا۔ اسکی ادارت محمد امین ابن مہجور کر رہے تھے۔ لیکن اسکے صرف دو شمارے ہی شایع ہو سکے اور اخبار نے دم توڑ دیا۔ اسطرح سے کشمیری زبان کی صحافت کو جنم لیتے ہی دھچکہ پہنچا۔

بیسویں صدی کے چوتھے دہے تک وقت کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ان کا اثر ریاست جموں وکشمیر پر بھی پڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ کشمیر میں شخصی راج کے خلاف جس تحریک کا آغاز ہو چکا تھا وہ نئے مرحلے میں داخل ہو گئی۔ سیاسی حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ یہاں کی صحافت بھی متاثر ہوئی۔ یہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ یہاں کی صحافت نے بھی یہاں کی سیاسی صورت حال کو موڑنے میں اہم رول ادا کیا۔ "ہمدرد" اور "مارتنڈ" کے ساتھ ساتھ نیشنل کانفرنس کا اخبار

"خدمت" وجود میں آگیا۔ جو یہاں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت نیشنل کانفرنس کا سرکاری ترجمان تھا۔ یہ اخبار آج تک برابر جاری ہے۔ اگرچہ یہ اب نیشنل کانگریس کا سرکاری ترجمان ہے۔ یہ اخبار صدرالدین مجاہد کی ادارت میں منظر عام پر آیا بعد میں غلام رسول عارف، مولانا محمد سعید مسعودی، غلام احمد کشفی، حکیم غلام محی الدین کے ہاتھوں سے گزر کر اب نند لعل واتل کی ادارت میں برابر شایع ہو رہا ہے۔ اس اخبار کی ایک بڑی تاریخ ہے اور اس میں کوئی دو رائیں نہیں کہ اس نے تحریک حریت کے دوران ایک بہت ہی نمایاں رول ادا کیا۔

اخبار "رنبیر" کے بعد جموں کے اخبار "چاند" کا ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ اسکے مالک اور ایڈیٹر مشہور صحافی فکشن رائیٹر اور ادیب نرسنگھ داس نرگس تھے۔ اخبار "چاند" ایک آزاد خیال اخبار تھا۔ اس اخبار نے بھی اردو صحافت کا بلند معیار قائم کرنے میں بڑی مساعی کی۔

۱۹۴۷ء کے بعد کئی نئے اخبارات کا اجراء ہوا اور آج تک اخبارات کی تعداد خاصی بڑھ گئی ہے۔ اب ہمارے یہاں اردو صحافت کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ہو چکی ہے۔ اس دوران یہاں بیسیوں اخبارات طلوع ہوئے اور ڈوب گئے، لیکن جن اخبارات نے برسوں کے سفر میں اپنا لوہا منوایا۔ ان میں چند قابل ذکر اخبارات کے نام یہ ہیں، کشمیر میں اخبار "ہمدرد" وتستا، مارتنڈ، دیش، کیسری، خدمت، حقیقت، صداقت، نور، خالق، البرق، جیوتی، رہنما، نوجیون، کشمیر ٹائمز، وکیل، خالد، آفتاب، سری نگر ٹائمز، آئینہ، اقبال، ہمارا استقلال، نوائے صبح، چٹان وغیرہ اور جموں میں رنبیر، امر، سویرا، وطن، پاسبان، سنگم، چاند، حقیقت، سدرشن، رفتار، خورشید، وغیرہ بدبھات اور المجاہد پونچھ سے نکلے، اسی طرح میر پور سے بھی کچھ اخبارات شایع ہوتے تھے تقریباً

سبھی اخبارات عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتے اور شخصی حکومت کے ظلم و تشدد کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حصول آزادی کے بعد یہ اخبارات اپنے منصب کے مطابق اپنے ملک کی تعمیر نو میں سرگرم عمل رہے اور ان میں سے بیشتر اخبارات اپنی صحت مند پالیسیوں کے مطابق سرکار کی تعمیری تنقید کرتے رہے ہیں اور سرکار کے لائحہ عمل اور سیاسی پارٹیوں کے منصب اور مقاصد کو معروضی نظر سے دیکھنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ اخبارات اپنی پالیسیوں کے تابع ہیں اور بعض اوقات یہ پالیسیاں بعض حلقوں میں پسند نہیں کی جاتی ہیں۔

برسوں کے اس تجربے نے ہماری ریاست کو جو قابل قدر صحافی دیئے۔ ان میں بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ مکندرام گرٹو، گوپی ناتھ گرٹو، ہرگوپال خستہ، سالگرام سالک، محمد الدین فوق، کشپ بندھو، ملک راج صراف، پریم ناتھ بزاز، معراج الدین احمد، غلام احمد کشفی، مولانا سعید، محمد ایوب صابر، پریم ناتھ کنہ، قیس شیروانی، دیاکرشن گردش، نرسنگھ داس نرگس، اللہ رکھا ساغر، جانکی ناتھ زتشی، نند لعل وانل، گنگا دھر بٹ دیہاتی، ثناء اللہ بٹ، صدرالدین مجاہد، صوفی غلام محمد، شمیم احمد شمیم، موتی لال مصری، موہن یاور، رشید تاثیر، وجے سوری، عبدالعزیز روشنی، غلام رسول عارف، گاشہ لال کول بی اے، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے ریاست میں صحافت کو ایک نیا معیار عطا کیا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ریاست میں اخبارات کے ساتھ ساتھ کچھ رسائل بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں "پریم اور فردوس" جو جموں سے شائع ہوتے تھے۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں ادبی رسائل تھے۔ "پریم" کی ادارت نرسنگھ داس نرگس کے ہاتھ میں تھی اور "فردوس" قیس شیروانی اور کشمیری لعل ذاکر

نکالتے تھے۔ ان رسایل کی مدد سے ریاست کے اردو ادیبوں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا اور انہی صفحات نے انہیں شہرت اور عزت بخشی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ فردوس میں پریم چند اور ان کی اہلیہ شیورانی کی کہانیاں بھی شایع ہوتی تھیں۔ ایک زمانہ میں ٹیچرس ٹریننگ اسکول سرینگر کی طرف سے ایک تعلیمی اور تدریسی پرچہ "تعلیم جدید" شایع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر پیرزادہ غلام رسول اور میر غلام رسول نازکی تھے اور نگران ناظم تعلیمات خواجہ غلام السیدین تھے۔ مہاتما گاندھی کے نئی تعلیم کے تصور بیسک ایجوکیشن (بنیادی تعلیم) کو عام کرنے اور اس طریقۂ تعلیم کے نظام کو سمجھانے میں اس رسالے نے بڑا رول ادا کیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو رسایل کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوا۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں محکمہ اطلاعات نے دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی کی ادارت میں "تعمیر" نکالا اور اس کا ایک شاندار شمارہ شایع ہوا لیکن بعض ناگزیر حالات کے پیش نظر اس کے بعد اس کی اشاعت رک گئی۔ جموں سے وید راہی نے "سویرا" موہن یاور نے سنگم اور نند گوپال باوا نے "نوری چم" شروع کیا۔ محکمہ دیہات سدھار کا رسالہ 'دیہاتی دنیا' باقاعدگی سے شایع ہوتا تھا۔ گنگا دھر بٹ دیہاتی نے اپنے ادارت کے زمانے میں اسے فعال پرچہ بنایا تھا۔

اسٹیٹ کلچرل کانفرنس نے اردو اور کشمیری میں "کونگ پوش" اور انجمن ترقی پسند مصنفین نے "آزاد" سری نگر سے نکالا۔ ایک اور رسالہ "گلریز" کافی عرصہ تک شایع ہوتا رہا۔ "کونگ پوش" بڑا معیاری پرچہ تھا اور ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا۔ "کونگ پوش" (اردو) کے صرف دو شمارے شایع ہوئے تھے لیکن "کونگ پوش" (کشمیری) کافی عرصہ تک باقاعدہ شایع ہوتا رہا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیری ادب میں جو ایک نئی سمت اور رفتار پیدا ہوئی۔ اس کا مطالعہ کرنے کے لئے

"کونگ پوش" کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ "گلریز" بڑا معیاری پرچہ تھا۔ سرینگر سے شایع ہونے والا یہ پرچہ کشمیری اور اردو دونوں زبانوں کے لئے وقف تھا۔ اپنے محدود وسایل کے باوجود "گلریز" نے یہاں کے ادبی رسایل میں اپنی منفرد جگہ بنالی تھی۔ سرینگر سے ہی دوسرے رسایل مثلاً 'دکھیل' ہما' دلکش' جھرنا' کیفوا' وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہے۔ اسی طرح جموں کے ترقی پسند مصنفین کا پرچہ "ادبیات" اور کچھ عرصہ کے بعد "دھنک" اور "العطش" کے نام سے مختلف رسالے وقفوں کے بعد جموں سے شایع ہوتے رہے۔ شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی نے اردو کے ادبی رسایل میں اہم اضافہ کیا اور مختلف وقتوں پر 'شعور' 'ادبیات' اور 'بازیافت' نام کے رسایل شایع کئے۔ بازیافت آج تک باقاعدگی کے ساتھ ہر سال شایع ہوتا ہے۔ اس کے کئی خاص نمبر شایع ہو چکے ہیں۔ معیار کے اعتبار سے اس کا شمار ملک کے بڑے ادبی رسالوں میں ہوتا ہے۔ عرصہ دراز سے ریاست کے کالجوں سے رسایل کی اشاعت ایک مستقل ادبی سرگرمی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ رسایل اردو' ہندی' کشمیری' ڈوگری' انگریزی' حصوں کے ساتھ برسوں سے شایع ہوتے آرہے ہیں۔ ان میں سے 'پرتاپ' 'لالہ رخ' 'تومی زبان' 'پمپوش' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ باغ دلاور خان کے ہائر سیکنڈری اسکول نے اپنا رسالہ "گاشہ آگر" کا ادلڈ بائز نمبر شایع کیا۔ شمیم مرحوم ماہنامہ "تعمیر" کے دور دویم میں اسکے ایڈیٹر تھے اور انہوں نے اپنے مدیر معاون محمد یوسف ٹینگ کی معاونت کے ساتھ "ماہنامہ تعمیر" کو ایک نئی جہت عطا کی تھی اور اسے ملک کے اردو داں طبقے میں روشناس کیا تھا۔ ٹیچرس ایسوسی ایشن کا ماہنامہ "استاد" استادوں کے مسایل لے کر کئی برس تک شایع ہوتا رہا۔ ادھر اب تعمیر تیسری بار شایع ہونے لگا ہے اور اپنے متنوع موضوعات سے اردو ادب

کی خدمت کر رہا ہے۔ ادبی رسایل کی اشاعت میں کلچرل اکادمی کی مساعی ناقابل فراموش ہیں۔ اس ادارے نے اشاعتی پروگرام میں بڑا قابل قدر کام کیا ہے۔ اس کے اہتمام سے کئی رسالے شایع ہو رہے ہیں۔ اردو میں گزشتہ کئی برسوں سے "ہمارا ادب" اور "شیرازہ" شایع ہو رہے ہیں۔ اسکے علاوہ ہندی، کشمیری، گوجری، انگریزی میں بھی شیرازہ شایع ہونے لگا ہے۔ ان رسایل کی اشاعت نے ادبی صحافت میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ان کی وساطت سے ریاست جموں و کشمیر کے ادب، ثقافت اور تاریخ کے بہت سے گوشے سامنے آ رہے ہیں۔ جن پر ابھی تک نظر نہیں گئی تھی۔ شیرازہ ملک کے ادبی حلقوں میں پسند کیا جا رہا ہے۔

کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا ادبیات، شعبۂ فارسی کا دانش، شعبہ ہندی کا وِتستا اور شعبہ کشمیری کا اہنار بھی اس میدان میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ گزشتہ برسوں میں کشمیری زبان کے چند اخبارات اور رسایل بھی سامنے آئے ہیں۔ ان میں کشمیر کلچرل آرگنائزیشن کا ہفتہ روزہ کاشُر اخبار، وطن، چمن، نیب، گلریز، ادیب، کاشُر ادب، واد وغیرہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ انگریزی رسایل میں محکمہ اطلاعات کا ماہنامہ کشمیر ٹوڈے گزشتہ کئی برسوں سے شایع ہوتا رہا ہے اور انگریزی قارئین تک کشمیر کے ادب، تاریخ اور ثقافت کے گوناگوں پہلوؤں کو پہنچانے کے سلسلے میں قابلِ قدر مساعی کرتا رہا ہے۔ اس طرح سے اس مختصر سے وقت میں کشمیر میں صحافت کا معیار بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ادب کے اس اہم شعبہ کو ترقی اور ترویج دینے میں یہاں کے ادیب اور فن کار بڑی لگن اور جگر کاوی سے سرگرم عمل ہیں اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ طباعت اور معیار کے اعتبار سے ابھی ہمارے اخبارات ملک

کے دوسرے اخبارات اور رسایل کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس کا سبب کتابت طباعت اور اشاعت کا جدید ساز و سامان اور سہولیات کا فقدان ہے جو ملک کے دوسرے اخبارات اور رسایل کو میسر ہے لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ محض ساٹھ سال کے اس قلیل عرصہ میں مواد اور معیار کے اعتبار سے صحافت کے شعبے میں ہماری سرگرمیاں مستحسن ہیں اور یہی کیا کم ہے۔

## کتاب نامہ

- کشمیر میں اردو — عبدالقادر سروری
- کشمیر میں اردو — حبیب کیفوی
- جموں و کشمیر میں اردو صحافت — صوفی محی الدین
- جلوۂ صد رنگ — برج پریمی
- آج کل، دہلی — کشمیر نمبر (فروری ۱۹۷۲ء)
- FIFTY YEARS AS A JOURNALIST — MULK RAJ SARAF
- A HISTORY OF KASHMIR — P.N.K. BAMZAI

# جموں و کشمیر میں اُردو تنقید

ڈوگرہ عہد کی تاریخ میں مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷ء۔ ۱۸۸۵ء) کی عہد حکومت کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اس بات کے باوصف کہ مہاراجہ خود قدیم علوم کا شیدا تھا۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ اس کی رعایا نئے علوم و فنون سے آراستہ ہو۔ اس غرض کے لئے مہاراجہ نے چند انگریزی مدرسے قائم کیے۔ اگرچہ یہاں کی درباری زبان فارسی تھی لیکن اب اس کا بول بالا کم ہونے لگا تھا۔ مہاراجہ نے علاوہ اور کاموں کے ایک دارالترجمہ کا قیام عمل میں لایا تھا۔ جس کا مقصد مغربی علوم کو ریاست کی دوسری زبانوں کے علاوہ اردو میں منتقل کرنا تھا۔ اس زمانے میں بدیا بلاس نام کا ایک سرکاری پریس (۱۸۸۲ء) قائم کیا گیا اور اسی پریس سے ریاست کے پہلے اخبار بدیا بلاس کا اجرا ہوا۔ جو سرکاری گزٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور ہندی اور اردو دونوں حروف میں شایع ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں بعض اہل قلم کشمیریوں نے لاہور، دہلی، الہ آباد اور ہندوستان

کے کئی شہروں سے اردو اخبارات جاری کئے۔ جن میں مختلف سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسایل پر مضامین شایع ہونے لگے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز سے کشمیری ادیبوں اور شاعروں نے اردو کے وسیلے سے اظہار خیال کرنا شروع کیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اردو زبان کی مقبولیت کے پیش نظر ۱۸۸۹ء میں اسے سرکاری زبان کا درجہ دیا لیکن اس کے باوصف اردو زبان میں کسی غیر سرکاری اخبار کو شایع کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست کے رہنے والے ادیب اور شاعر کھل کر اظہار خیال نہ کر سکے اور انہیں بیرون ریاست سے شایع ہونے والے اخبارات اور رسایل کا ممنون منت ہونا پڑا۔ مدتوں بعد جموں سے ۱۹۲۴ء میں لالہ ملک راج صراف نے ریاست کا پہلا اخبار "رنبیر" اور پنڈت پریم ناتھ بزاز نے ۱۹۳۲ء میں "وتستا" اور ۱۹۳۵ء میں ہمدرد سری نگر سے جاری کیا۔ ان اخباروں کا اجرا فعال ثابت ہوا۔ اور مقامی قلم کاروں کو جنہوں نے اب اردو زبان میں عبور حاصل کیا تھا شعر و ادب میں قدم جمانا شروع کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ پورا دور ہمارے لکھنے والوں کے لئے تشکیلی اور عبوری دور تھا۔ اس لئے یہ توقع کرنا کہ ہمارے لکھنے والوں نے ادب کی جملہ اصناف پر قلم اٹھایا ہوگا۔ اور خاص طور پر ادبی تنقید جیسے کٹھن شعبے میں اپنا جوہر آزمایا ہوگا۔ بالکل بے جا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں اردو تنقید کے ابتدائی نقوش محمد الدین فوق مرحوم کی بعض تحریروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ فوق کا تنقید کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی یہ ان کا میدان تھا انہوں نے تاریخ، شاعری، فکشن، تحقیق کئی میدانوں میں چراغ روشن کئے۔ یہ صحیح ہے کہ فوق کی تحقیق و تلاش کا اصل دائرہ تاریخ ہے۔ لیکن انہوں نے کئی ایسے تذکرے بھی تالیف کیے جن کا تعلق براہ راست

اردو ادب کے ساتھ ہے۔ یادِ رفتگان، تذکرۂ علمائے لاہور، تذکرۂ شعرائے لاہور
تذکرہ اخبار نویساں اور اس قبیل کی متعدد تصنیفات ہیں جو اگرچہ تحقیقی نوعیت
کی ہیں لیکن ان میں اقتضائے زمانہ کے مطابق تنقیدی خیالات کا اظہار ملتا ہے۔
یہ خیالات کسی خاص اصول کے مطابق نہیں البتہ اسی طرح کے ہیں جس طرح کا
اظہار اس زمانہ کے تذکروں میں ملتا ہے۔

ادبی تنقید کے ابتدائی نمونوں میں محمد عمر نور الٰہی صاحبان کی معرکتہ الآرا تصنیف
ناٹک ساگر تسلیم کی جا سکتی ہے۔ یہ دونوں دوست مشترکہ نام سے برسوں تک مشترکہ
کارنامے انجام دیتے رہے۔ انہوں نے افسانوں اور ڈراموں کے علاوہ ڈرامے
کی صنف سے متعلق کئی قابل قدر کارنامے انجام دیئے۔ ان کا سب سے بڑا اور
قیمتی کارنامہ "ناٹک ساگر" ہے۔ جو پہلی بار لاہور کے مرکنٹایل پریس سے ۱۹۲۴ء
میں شایع ہوا تھا۔ اس کتاب کو ڈرامانگاری کے فن پر پہلی اردو تصنیف قرار دیا
جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب اردو ڈرامے کی جامع تاریخ نہیں
ہے اور اس میں کئی خامیاں ہیں۔ لیکن اردو ڈرامے اور تھیٹر کی تحریک کا کوئی سنجیدہ
قاری یا ناقد اس کتاب کو صرف نظر نہیں کر سکتا۔ ناٹک ساگر پندرہ ابواب پر
تقسیم ہے اور اس میں یونان سے لے کر ہندوستان، چین، جاپان اور روس تک
مشرق اور مغرب کے ڈراما کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنفین نے اس
بات کا اعتراف یوں کیا ہے:-

> "واقعات کی صحت کے ہم ذمہ دار ہیں مگر محاسن ادبی
> کے مدعی نہیں۔ یہ بھی دعوے نہیں کہ یہ کتاب جامع
> اور ڈراما کے جملہ کوائف پر محتوی ہے۔ جس کتاب کی
> تکمیل کے لئے سرسید کی تحقیق آزاد کا قلم، سرشار کی فطرت

طرازی اور انسائیکلوپیڈیا کی کشادہ دامانی درکار ہو وہاں
ہمارا قلم کیونکر مقدم چل سکتا ہے۔ اس لئے ہم ان
اصحاب سے عذر خواہ ہیں جو کسی کتاب کا سرمایہ کمال
فقط الفاظ کی نشست تراکیب کی چستی اور محاورے
کے چٹخارے کو سمجھتے ہیں کہ ان کی ضیافت طبع کا بہت
کم سامان یہاں مہیا ہے۔"

(ناٹک ساگر از محمد عمر نورالہٰی ص ۲)

ناٹک ساگر ایک طرح سے عالمی ڈرامے کی مختصر تاریخ ہے اور اس کا بنیادی
کینڈا تحقیق پر استوار ہے لیکن اس میں تنقیدی منصب سے بھی عہدہ برآ ہونے
کی سعی کی گئی ہے۔ اس خصوصیت کے پیش نظر اس کتاب کے فاضل مقدمہ نگار
علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی نے لکھا ہے:۔

"یہ وہ کتاب ہے جو اردو ادیبوں اور ڈراما نویسوں
اور سٹیج یعنی تھیٹر کے ہر قسم کے متعلقین کے لئے
روزنامچہ ہدایات کا کام دیگی یورپ کے ڈرامہ کی
عہد بہ عہد ترقی، اس کا عروج، ارتقاء اور تنزل فن تمثیل
یعنی ایکٹنگ، سٹیج کا لباس اور سینری وغیرہ ایسے
مطالب ہیں۔ جن کا ذکر جا بجا اس کتاب میں آیا ہے
اور جن پر موزخانہ تبصر کے ساتھ ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

(ناٹک ساگر ص ۸-۹)

علامہ کیفی نے ناٹک ساگر کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ برحق
ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ مصنفین نے بڑی جگر کاوی کے ساتھ اپنا مواد اکٹھا

کیا ہے۔ بلکہ اس پر مختصر ہی سہی اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس طرح سے یہ ہمارے یہاں عملی تنقید کا اولین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

۱۹۲۶ء میں محمد عمر نورالٰہی نے امانت کی اندر سبھا مرتب کرکے شایع کی یہ ایڈیشن بھی لاہور ہی سے شایع ہوا۔ اس ایڈیشن کا امتیاز یہ ہے کہ مرتبین نے ڈرامے کو دو ایکٹوں اور کئی سینوں میں تقسیم کرکے ایک نئی صورت میں پیش کیا ہے۔ مرتبین نے اپنے مقدمے اور حواشی سے کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ یہ حصہ ان کے ذوق تحقیق اور تنقیدی شعور کا غماز ہے۔ اندر سبھا کے متعدد ایڈیشن شایع ہوئے ہیں لیکن اس ایڈیشن کا اپنا مرتبہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

تنقید کے شعبے میں عبدالاحد آزاد کی گراں قدر تصنیف "کشمیری زبان اور شاعری" کی اپنی اہمیت ہے۔ آزاد نے ۱۹۳۵ء کے آس پاس شاعر کشمیر مہجور سے متعلق "حیات مہجور" کے عنوان سے ایک مختصر سا مقالہ لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن ان کے ذوق جستجو نے اس کام کو وسعت دی اور ایک ضخیم مسودہ ۱۹۴۷ء سے قبل تیار ہوا۔ یہ مسودہ ان کی حیات میں شایع نہ ہو سکا اور آزادی کے بعد ۱۹۵۹ء میں ریاستی کلچرل اکادمی کے اہتمام سے تین جلدوں میں "کشمیری زبان اور شاعری" کے عنوان سے شایع ہوا۔ بنیادی طور پر یہ تحقیقی کارنامہ ہے اور اس کے ہر صفحے پر آزاد کی محققانہ دیدہ وری، لگن اور تلاش و جستجو کا پتہ چلتا ہے۔ اس قابل قدر اور معتبر تذکرے میں للہ دید سے لے کر مہجور کے عہد تک بیشتر شعراء کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ ان میں معروف اور غیر معروف دونوں قسم کے شعراء شامل ہیں۔ لیکن اس کی اہمیت اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ آزاد نے تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید کا حق ادا کیا۔

"کشمیری زبان اور شاعری" جس کے لئے آزاد نے تاریخ ادبیات کشمیر کا نام تجویز کیا تھا۔ کشمیری زبان کی شاعری کی تاریخ ہے۔ بعض معترضین کا یہ کہنا ہے۔

کہ آزاد کی تصنیف اردو تنقید کے زمرے میں شامل نہیں کی جاسکتی۔ اس رائے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بنیادی طور پر آزاد کی یہ تصنیف کشمیری زبان کی شاعری سے متعلق ہے۔ لیکن اسے اردو ادب میں ایک قابل قدر تنقیدی اور تحقیقی تصنیف قرار دیا جاسکتا ہے۔ آزاد کشمیر کے پہلے محقق اور ناقد ہیں جنہوں نے اردو میں اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ جب ہم دوسری زبانوں کی ایسی تصانیف کو جنہیں ہمارے ادیبوں اور ناقدوں نے اردو جامعہ پہنایا اپنے ادب کے کھاتے میں نمایاں جگہ دیتے ہیں۔ تو ایک ایسی کتاب کو جو کشمیری ادبیات سے ہی سہی لیکن اردو زبان کے توسط سے تحریر کی جائے اور جو ترجمہ یا تالیف نہ ہو بلکہ بالکل طبع زاد ہو تو ایسی تصنیف کو اپنے ادبی کارناموں میں شمار کرنے سے گریز کیوں ہے۔ میں اسے اپنی تنگ نظری کے سوائے کچھ اور نہیں سمجھتا۔ اس تصنیف کی تنقیدی اہمیت اس لئے بن جاتی ہے کہ آزاد نے تاریخی اور سماجی پس منظر کی مدد سے نتائج اخذ کیے ہیں اور کشمیری زبان کے ارتقاء پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور مختلف ادوار کے شعرا کا ذکر کرتے ہوئے اپنی پوری تنقیدی بصیرت کو بروئے کار لایا ہے اور ان کے کلام کو پرکھ کر ان کے ادبی مقام کا تعین کیا ہے۔ آزاد کو محض ایک تذکرہ نویس قرار دیکر بات ختم نہیں ہوتی۔ ایسا کرنا ہماری کور ذوقی ہوگی۔ آزاد نے باقاعدہ درسیات صرف پرائمری کی تین جماعتوں تک حاصل کر لی تھی۔ لبعد میں فارسی ادبیات منشی کا امتحان کامیاب کیا تھا۔ اس قدر کم تعلیم یافتہ ہونے اور انگریزی ادبیات سے باقاعدہ طور پر کوئی تعلیم حاصل نہ کرنے کے باوصف وہ ایک گہری تنقیدی بصیرت کے مالک تھے اور ایسے وسیع نظر ناقد کی حیثیت سے ابھرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ان کا اپنا بیان ملاحظہ ہو:۔

"ہر انقلاب پرانے تہذیب و تمدن کو نئے سانچے
میں ڈھالتا ہے۔ ادب بھی انسانی زندگی کے ساتھ
ساتھ اس کی ہر منزل پر نئے روپ بدلتا ہے مگر
ہر نئے ادب کو پرانے ادب کے ساتھ گہرا ربط
ہوتا ہے۔"

(کشمیری زبان اور شاعری از عبدالاحد آزاد جلد اول)

اس طرح سے آزاد روایت کا احترام کرتے ہیں اور ساتھ ہی ادب کے بدلتے ہوئے نظریات کا خیر مقدم کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ آزاد بدلتے ہوئے ہر عہد کی کڑیاں ماضی کے ساتھ جوڑتے ہیں اور یہی ان کے سائینی نقطہ نظر کا غماز ہے۔ آزاد کے یہاں عملی تنقید کے اچھے نمونے بھی ملتے ہیں ان کی تنقیدی بصیرت کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ذکر ہو چکا ہے کہ وہ معمولی تعلیم یافتہ پرائمری سکول مدرس تھے اور بظاہر انگریزی ادبیات کا کوئی علم نہیں رکھتے تھے۔ لیکن وہ تحلیل نفسی، ادب برائے ادب، ادب برائے حیات اجتماعی ادب اور زندگی سے واقف ہیں اور آزادی اور بے باکی سے ایسے مباحث کو سمیٹتے ہیں۔ اپنی کتاب کے آغاز میں ان تمام انگریزی کتابوں کی فہرست مرتب کرتے ہیں۔ جن میں کشمیری زبان کے تعلق سے غیر ملکی عالموں نے اظہار خیال کیا ہے۔ آزاد کی ضخیم کتاب کا تیسرا حصہ خاص طور پر تنقیدی مباحث کے لئے مخصوص ہے۔

نندلال طالب ہمارے معروف اور نامور شاعر تھے۔ شاعر کی حیثیت سے اپنے زمانے میں انہیں کافی شہرت حاصل ہوئی۔ لیکن اس کے باوصف نقد و انتقاد سے بھی انہیں دلچسپی تھی۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ان کے اپنے شعری مجموعوں پر خود لکھے ہوئے دیباچے، بہار گلشن کشمیر پر ان کا بھرپور اور مبسوط تبصرہ اور سب سے بڑھ کر

کلام غالب پران کا تبصرہ ان کی تنقیدی صلاحیت پر دال ہے۔ وہ شاعری کے بارے میں اپنا مخصوص نظریہ رکھتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"شاعرانہ لطافت کا حظ اٹھانے کے لئے شعر و سخن کا مذاق صحیح ہونا لازمی ہے۔ بلا اس قید کے شاعری بے تال اور سر کے گانے سے زیادہ دلکش نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ محض روزمرہ اور محاورہ صفائی اور زبان کے مصنوعی تکلفات کا نام شاعری نہیں ہے۔ شعر میں پاکیزگی، لطافت کے علاوہ تاثیر بھی ہونی چاہیے"۔

(جگ موہن رینہ شوق (بہار گلشن کشمیر جلد دوم ص ۲۴)

طالب نظریاتی طور پر ترقی پسند شاعری کے اس حصے سے نالاں تھے۔ جس میں شاعروں سے زیادہ متشاعر اور تک بند شہرت پا گئے تھے۔ وہ اقتضائے زمانہ کے مطابق ادبی انقلاب کا خیر مقدم کرتے ہیں لیکن بے قافیہ اور باقافیہ نظموں میں تصنع آمیز واردات سے سمجھوتہ کر پاتے تھے اور یہ شکایت انہیں جدید ناقدوں سے بھی تھی لکھتے ہیں:

"حال میں بہم پہنچائے ہوئے لٹریچر کا بیشتر حصہ اصلی جذبات کا موقع ہونے کے بجائے اکثر سطحی ہنگامہ آرائی کا آئینہ دار ہے۔ اس افراط و تفریط کے طوفان بے تمیزی کے باعث عوام میں اصلی اور نقلی شاعری میں امتیاز کرنے کی اہلیت مفقود دکھائی دیتی ہے۔"

(مرقع افکار

---

نند لال طالب ص ۴ )

لیکن طالب کا تنقید کے شعبے میں وتیع کارنامہ جائزہ کلام غالب ہے۔ یہ دراصل مضامین کا طویل سلسلہ ہے جو انھوں نے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر اور اس ادارہ کے سہ ماہی رسالہ "نوائے ادب" کے مدیر نامدار پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی کے ایما پر شروع کیا۔ یہ مضامین بالاقساط اس رسالے میں اکتوبر ۱۹۶۱ء سے اپریل ۱۹۶۸ء تک سرمایہ کلام غالب کے عنوان سے شایع ہوتے رہے بعد میں یہ کتاب جائزہ کلام غالب ۱۹۸۰ء کے عنوان سے شایع ہوئی اس کتاب میں طالب نے اپنے مطالعہ غالب کے برسوں کا نچوڑ پیش کیا ہے اور اپنے انداز سے غالب کے کلام کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے اہم مندرجات میں حقیقت شعر و شاعری، محاسن کلام، مصائب کلام، قنوطیت، معنی آفرینی، زبان و بیان پر اعتراضات کی اصلیت، پہلو دار طرز ادا، مرزا اور دیگر شعراء کے کلام میں مماثلت و ہم آہنگی، مرزا کے کلام میں تکرار وغیرہ اہم مباحث ہیں۔ یہ تصنیف یقیناً غالبیات میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

پریم ناتھ بزاز کشمیر میں قد آور صحافی ہوئے ہیں۔ رنبیر جموں کی اشاعت کے بعد انھوں نے صوبہ کشمیر سے سب سے پہلا اخبار "وتستا" (۱۹۳۲ء) جاری کیا اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا بعد میں "ہمدرد" بھی جاری کیا اور دونوں اخبارات میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال کرتے رہے۔ تاریخ، ثقافت اور فلسفہ ان کا خاص موضوع رہا ہے۔ انگریزی اور اردو میں ان کی متعدد کتابیں شایع ہوئی ہیں۔ تنقید کے شعبے میں ان کی تصنیف "شاعر النسانیت" (۱۹۵۲ء) کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہ تصنیف عبدالاحد آزاد کی شاعری سے متعلق ہے اور ناقدانہ انداز نظر سے آزاد کے تخلیقی ذہن کے سوتوں تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آزاد کی مطبوعہ شاعری کو اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہوئے بزاز لکھتے ہیں:

"ہم اس وقت ان کی شاعری کو ہی زیر بحث لانا
چاہتے ہیں۔ نثر کو نہیں۔ شاعری میں بھی ہم اس حصہ
کو نظر انداز کرتے ہیں۔ جو ان کی ابتدائی زندگی سے متعلق
ہیں۔ جب کہ وہ قومی مسایل اور سماجی سوالات کی
طرف زیادہ دھیان نہیں دیتے ہیں۔ آزاد کی شاعری
کا بیشتر حصہ ابھی شایع نہیں ہوا ہے۔ بلکہ جو کچھ اس
وقت تک پبلک کی نظروں سے گزر چکا ہے۔ اتنا
ہی ہماری تنقید کا موضوع ہے۔"

(شاعر انسانیت۔ از پریم ناتھ بزاز ص ۲۰)

بزاز خود ایم۔ این۔ رائے کے RADICAL HUMANISM سے متاثر تھے اور
بزاز کے اثر سے آزاد بھی اس نظریے کے قریب تھے۔ بزاز نے اسی نقطہ
نظر سے آزاد کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کتابچے میں بزاز کی کسی گہری
تنقیدی بصیرت کا پتہ نہیں چلتا اور نہ ہی اس میں کوئی تنقیدی استدلال نظر آتا ہے
لیکن اس کی ایک تاریخی اہمیت ضرور ہے۔ اگرچہ بزاز آزادی سے برسوں پہلے اردو
میں لکھتے تھے لیکن ان کی یہ کتاب ۱۹۴۷ء کے بعد ہی شایع ہو سکی۔

کشمیر میں نقد و انتقاد کی طرف ہمدرد' اور مارتنڈ' (کشمیر) رنبیر اور چاند
(جموں) اور کئی دوسرے ریاستی پرچوں نے دلائی۔ جن کے کالموں میں کہیں کہیں
نقد ادب کی بکھری ہوئی مثالیں ملتی ہیں۔ یہاں کی ادبی انجمنوں کی کارگزاری
کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں جموں کی بزم سخن اور سری نگر کی
اردو سبھا اور انجمن ترقی پسند مصنفین نے قابل قدر کام کیا۔ اردو سبھا کے روح
رواں اردو دنیا کی معروف شخصیت ڈاکٹر تاثیر تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین

پریم ناتھ پردیسی اور رامانند ساگر کی مساعی سے منظم ہوئی تھی۔ اس کے جلسوں میں اور لوگوں کے علاوہ ملک کے ترقی پسند ادیب و شاعر بھی شریک ہوا کرتے تھے ان معنوں میں مختلف تخلیقات پڑھی جاتی تھیں اور پھر ان پر تنقید ہوا کرتی تھی۔ پروفیسر محمود ہاشمی [۱] کا تعلق بھی اس انجمن کے ساتھ تھا۔ پروفیسر ہاشمی اسی ریاست سے تعلق رکھتے تھے اور مقامی کالج میں پڑھاتے تھے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے کہانی اور یا ارود ڈرامانگار تھے بلکہ نقد وانتقاد کے ساتھ بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ہاشمی ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ اور اسی نقطہ نظر سے ادب کے مسایل پر بحث کرتے تھے۔ امر سنگھ کالج کے میگزین لالہ رخ اور دوسرے پرچوں میں ان کے تنقیدی مضامین شایع ہوتے تھے۔ ترقی پسندی کا مفہوم اور امکانات، اختر شیرانی، خواجہ احمد عباس اور محمد حسن عسکری پر ان کے مضامین ایک متوازن اور سنجیدہ اور سلجھے ہوئے صاحب نظر کے تنقیدی مضامین ہیں۔ علامہ کیفی، خلیفہ عبدالحکیم، جعفر علی خان اثر، ڈاکٹر تاثیر جیسے نقادوں نے بھی ۱۹۴۷ء سے قبل کشمیر میں اپنے قیام کے دوران برسوں اردو ادب کی آبیاری کی اور یہاں شعر وادب کا ایک سنجیدہ ماحول قائم کرنے میں حتیٰ المقدور مستحسن کوششیں کیں۔ یہ لوگ محض شعروشاعری نہیں کرتے تھے بلکہ مختلف ادبی مجلسوں میں مقالات پڑھتے تھے اور دوسروں سے لکھواتے تھے جن میں شعروادب کے متعدد مسایل زیر بحث آتے تھے۔ ریاست میں نقد وانتقاد کی طرف متوجہ کرنے کی ان شعوری اور سنجیدہ کوششوں کو صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ابھی تنقید کی کوئی مخصوص ذکر سامنے نہیں آئی تھی۔

کشمیر میں اردو تنقید کی طرف آزادی کے بعد صحیح معنوں میں بھرپور توجہ ہوئی دراصل ۱۹۴۷ء کے بعد پورے برصغیر میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا اور اس

[۱] محمود ہاشمی آزادی کے بعد پاکستان چلے گئے۔ ان کی تصنیف "کشمیر اداس ہے" ہے۔

سے اردو ادب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ نفسیات، معاشیات اور سماجیات کی طرح ادب کے مسایل بھی سائینٹی البصیرت سے پرکھنے جانے لگے۔ مغرب میں اس سے قبل جو فکری تحریکیں چلی تھیں اس نے عالمی ادب کو متاثر کیا۔ اردو بھی اس سے اپنا دامن بچا نہ سکی۔ ایک نیا ذہنی رویہ سامنے آگیا اس نے ادب کے مختلف شعبوں کی طرح تنقید کے زاویے بھی بدل ڈالے۔ چنانچہ ادب کے نئے اور پرانے تجربوں کو پرکھنے کے لئے نئے معیار اور نئے اصول مرتب ہوئے ذہن کے دریچے کھل جانے سے تعصبات کم ہونے لگے۔ کشمیر میں اردو ادبیات سے دلچسپی کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ ہمارے اردو کے ادیب یا تو شاعر تھے یا افسانہ نگار اور "واہ واہ" کے قایل تھے۔ تحقیق و تنقید کی طرف بہت کم توجہ تھی۔ یہ معاملہ برسوں تک برصغیر میں بھی ادب کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اور ۱۹۳۶ء کے بعد ہی ادب کے مختلف شعبوں کا احاطہ کیا جانے لگا۔ جن میں خاص طور پر ادبی تنقید کو شامل کیا جا سکتا ہے لیکن یہاں اس طرف آزادی کے بعد دلچسپی کا اظہار کیا جانے لگا۔

۱۹۴۷ء میں کشمیر پر قبایلی حملے کے دوران ریاستی ادیبوں اور شاعروں نے ایک ثقافتی محاذ منظم کیا۔ اس کا مقصد ادب اور ثقافت کے محاذ سے خاموش وطن کی حفاظت کرنا تھا۔ اس کا نام کلچرل محاذ یا کلچرل فرنٹ تھا۔ اس کا صدر دفتر نمائش گاہ کی ایک بارک میں تھا۔ بعد میں یہ فرنٹ آل جموں و کشمیر کلچرل کانگریس کے نام سے مشہور ہوا اور اسے تین شعبوں میں تقسیم کیا گیا۔ تھیٹر اور ڈراما، مصوری، شعر و ادب۔ آخر الذکر شعبے کا نام انجمن ترقی پسند مصنفین تھا۔ پردیسی جس ترقی پسند مصنفین کے بانی تھے یہ انجمن اس سے مختلف تھی اور کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک شاخ کے طور پر سرگرم عمل تھی۔ اس انجمن کے ساتھ اس دور کے تقریباً سبھی چھوٹے

بڑے قلم کار اور فن کار وابستہ تھے۔ بزرگوں میں پریم ناتھ پردیسی، ماسٹر زندہ کول مہجور عاصی، عارف وغیرہ تو تھے ہی۔ نئی نسل کے ادبا اور شعرا میں دینا ناتھ نادم، رحمان راہی، امین کامل، اختر محی الدین، بنسی نردوش، تیج بہادر بھان، سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، مہندر رینہ، حبیب کامران، عزیز ہارون، نور محمد روشن، ارجن دیو مجبور، دیپک کول خاص طور قابل ذکر ہیں۔ خواجہ غلام محمد صادق، غلام رسول رینزو، نور محمد، موتی لال مصری، پیر غیاث الدین، پران ناتھ جلالی، بدری ناتھ نشاط، پیر عبدالاحد اور دوسرے سیاسی کارکن اور دانشور بھی انجمن کے ہفتہ وار جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان جلسوں نے ایک ادبی تحریک کا آغاز کیا تھا اور ادب کی نئی راہیں متعین کرنے میں مدد دی یوں تو اس انجمن کے انہی جلسوں کے ذریعے کشمیری ادب کا احیائے نو ہوا۔ لیکن کشمیر میں اردو کی ترقی اور توسیع کے لئے یہ تحریک فعال ثابت ہوئی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان سب ساتھیوں میں بیشتر لوگ اردو کے ادیب اور شاعر تھے اور آج کے جتنے بھی کشمیری زبان کے سربرآوردہ شاعر اور ادیب ہیں جن کا تعلق اس انجمن سے رہا ہے اردو کے شاعر اور افسانہ نگار تھے۔ بلکہ اردو سے ہی لکھنے کی شروعات کیں۔ میری مراد نادم، راہی، کامل، اختر، نردوش، دیپک، تیج، زتشی، لون، مہندر رینہ، حبیب کامران وغیرہ سے ہے۔ ان سب کی جولاں گاہ اردو زبان تھی۔

انجمن کے جلسوں میں صرف شعر اور افسانے نہیں پڑھے جاتے تھے کھل کر بحثیں ہوتی تھیں اور کاروائی تحریریں لائی جاتی تھی۔ یہ لوگ ترقی پسند تھے اور اکثر و بیشتر کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ وابستہ تھے یا ہمدرد تھے۔ چنانچہ "تنقید کا رخ انتہا پسندانہ تھا اور دہی صورت حال تھی جو ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کے آغاز میں پوری اردو دنیا میں تھی۔ جہاں ترقی پسند تنقید کے معیار کے مطابق

شعر و ادب کو پرکھا جاتا تھا۔ شعر و ادب کے سلسلے میں افہام و تفہیم کا ایک نیا انداز نظر سامنے آیا۔ یہ صحیح ہے کہ یہاں اشتراکی اور ترقی پسند انتہا پسندی شعر و ادب کو پرکھنے کا معیار تھا اور ادب کو ایک خاص ڈھرے کی طرف لیا جا رہا تھا لیکن یہاں کی ادبی فضا کو نکھارنے اور شعر و ادب کے بارے میں ایک واضح نقطۂ نظر اپنانے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ اس انجمن کے روح رواں ہندی کے مشہور ترقی پسند ادیب، ناول نگار اور نقاد شودہاں سنگھ چوہان تھے۔ جو غالباً مرکزی انجمن کی ہدایت کے مطابق یہاں برسوں رہے اور انجمن کی سرگرمیوں کو فعال بنایا۔ انجمن کے جلسوں میں وقتاً فوقتاً ڈاکٹر رام بلاس شرما، علی سردار جعفری، ضیا احمد، ڈاکٹر سلامت اللہ وغیرہ شریک ہوتے تھے اور بحث و مباحثے میں حصہ لے کر یہاں کے ادیبوں کے لئے نئی سمت متعین کرنے میں مدد دیتے تھے۔ ذکر ہو چکا ہے کہ ہندوستان کی ترقی پسند ادبی تحریک کے مانند یہ انجمن بھی جذباتیت اور کھوکھلی نعرہ بازی کا شکار ہو گئی۔ لیکن اس بات کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ اردو تنقید کو بالخصوص ان جلسوں میں وسعت حاصل ہوئی۔ اور وہ مسایل جو تنقیدی کتابوں کے مطالعے سے سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ یہاں عملی تنقید کے طریقہ کار سے سمجھ میں آنے لگیں۔ انجمن کی کاروائیاں انجمن کے ترجمان کونگ پوش میں شایع ہوتی تھیں۔

اس دوران ترقی پسند خیالات پر استوار پہلا رسالہ "آزاد" سری نگر سے شایع ہونے لگا۔ جس میں علاوہ شعر و ادب کے تنقیدی مضامین بھی شایع ہونے لگے۔ "آزاد" کچھ عرصے کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے بعد اردو اور کشمیری زبان میں "کونگ پوش" نام کے رسایل کا اجرا ہوا۔ یہ رسالے انجمن کے ترجمان تھے۔ اردو کونگ پوش خاص طور پر اردو لکھنے والوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس طرح سے نقد و انتقاد کی

طرف پہلی بار سنجیدگی سے توجہ ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد نئی نسل سے تعلق رکھنے والے کچھ نوجوان سامنے آئے۔ ان میں خاص طور پر شمیم احمد شمیم مرحوم کا نام قابل ذکر ہے۔ شمیم ایک آندھی کی طرح اٹھے۔ اپنی شعلہ بیانی اور قلم کے تیکھے انداز سے بہت ہی قلیل عرصہ میں پوری ادبی فضا پر چھا گئے۔ ابتدا میں شمیم سٹیٹ کلچرل کانفرنس میں شامل ہوئے بعد میں لٹریری فورم کے نام سے ایک الگ ادبی تنظیم کھڑا کر دی۔ شمیم خطرناک حد تک بے باک تھے۔ بہت پڑھے لکھے نوجوان تھے۔ سائینس کے طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ اردو شعر و ادب سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ اردو کے کلاسکی لٹریچر پر ان کی نظر تھی اور بدلتے ہوئے ادبی مزاج سے آشنا تھے۔ ان کا بنیادی میدان تنقید تھا۔ اگر وہ سیاست اور صحافت کی لپیٹ نہ آجاتے اور جواں مرگ نہ ہوتے تو آج ان کا شمار ملک کے بڑے اچھے ناقدوں میں ہوتا۔ شمیم ترقی پسند تھے لیکن اشتراکیت سے انہیں دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سائنٹفک تنقید کے رسیا تھے۔ وہ اپنی تنقیدوں میں سیاسی فلسفہ نہیں بگھارتے تھے۔ وہ روایت کے عاشق تھے لیکن ساتھ ہی جدید ذہن بھی رکھتے تھے۔ ان کا انداز نظر معروضی تھا۔ وہ کسی بندھے ٹکے فارمولا کے تحت اظہار خیال نہیں کرتے تھے۔ ان کے بیشتر تنقیدی مضامین اس زمانے میں ان ہی کی ادارت میں شایع ہونے والے ماہنامہ "تعمیر" میں شایع ہوئے۔ تعمیر کو پورے ملک کے ادبی حلقوں میں پایہ اعتبار حاصل تھا۔

اردو کے خدمت گذاروں میں ڈاکٹر عزیز احمد قریشی کا نام بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ عزیز احمد کا بنیادی موضوع دینیات تھا۔ وہ مسلمانوں کے احمدیہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اس کے تعلق سے انہوں نے کئی چھوٹی بڑی کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن شعر و ادب کے ساتھ ان کی دلچسپی کم نہ تھی۔ اس سلسلے

میں ان کی دو تصانیف "ہماری قومی اور انقلابی شاعری (۱۹۵۹ء) اور جدید تنقیدی زاویے (۱۹۶۰ء) قابل ذکر ہیں۔ ہماری قومی و انقلابی شاعری میں سیاسی شاعری قومی شاعری انقلابی شاعری کی تفہیم جیسے موضوعات پر بحث کی گئی ہے اور جدید تنقیدی زاویے میں شاعری کے بارے میں یورپی نقادوں کے تاثرات، شاعری کے لوازمات، لاشعوریت، ابہام، تحریر کے اسٹائل، تنقید کے نظریات، شاعری برائے موسیقی اور ایسے ہی بہت سے مسائل [illegible] ملتے ہیں۔ اس مواد کی بنیاد بقول ڈاکٹر قریشی ان کے زمانہ طالب علمی میں تیار کئے ہوئے نوٹس ہیں۔ لہٰذا شعر و ادب کے بارے میں گہری بصیرت کی تلاش یہاں عبث ہے لیکن اس کے باوصف ڈاکٹر قریشی نے خاصا مواد تلاش کیا ہے اور اسے ترتیب و تنظیم کے ساتھ پیش کر کے اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر قریشی کسی ادبی مکتبہ فکر سے تعلق نہیں رکھتے۔ انہوں نے اپنے ذوق سلیم کو رہنما بنا لیا ہے۔ آزادی کے بعد اردو ادبی تنقید کو سنجیدگی سے کئی ناقدوں نے اپنا موضوع خاص بنایا۔ ان میں سے بعض دیدہ وروں نے جودت ذہن کے ایسے چراغ روشن کیے کہ نہ صرف ریاستی سطح پر بلکہ پورے ملک بلکہ برصغیر میں اپنا مقام بنایا اور شہرت اور عزت پائی۔ ان میں سے بلند قامت نام پروفیسر حامدی کاشمیری کا ہے۔ حامدی کی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ انہوں نے شاعری، افسانے، ڈرامے، تحقیق اور تنقید پر اپنا زور قلم آزمایا ہے ادھر چند برسوں سے انہوں نے ادبی تنقید کی طرف خاص توجہ کی ہے۔ ان کے اہم تنقیدی کارناموں میں جدید اردو نظم پر یورپی اثرات، غالب کے تخلیقی سرچشمے، نئی حسیت اور عصری اردو شاعری، غالب اور اقبال کا رگہ شیشہ گری، میر کا مطالعہ، ناصر کاظمی کی شاعری وغیرہ ہیں جدید اردو نظم پر یورپی اثرات ان کا تحقیقی مقالہ ہے لیکن اس میں تحقیق سے زیادہ تنقید ملتی ہے۔ یہ اردو نظم کے

ایک خالص تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے اور حالی اور آزاد کے دور سے ۱۹۴۷ء تک اردو کی نظمیہ شاعری کا احاطہ کرتا ہے۔ غالب کے تخلیقی سرچشمے میں غالب کی نفسیات کا مطالعہ کیا گیا ہے اور غالب کے فکری سرچشموں کی بازیافت کرنے کی بہت اچھی کوشش کی گئی ہے۔ حامدی آرٹ کی تعینِ قدر کرتے وقت شاعر سے زیادہ اس کی شعری کائنات کو اہم قرار دیتے ہیں اور آرٹ کی فنی اور جمالیاتی قدر و قیمت کو اہمیت دیتے ہیں۔

حامدی روایتی تنقید سے انحراف کرتے ہیں۔ وہ جدیدیت اور نئی حسیت سے متاثر ہیں۔ لیکن اس میں بھی انہوں نے اپنا ایک الگ راستہ کھوج نکالا ہے۔ حامدی کی تنقیدی تصانیف میں نئی حسیت اور عصری شاعری اپنے موضوع کے اعتبار سے اہم ہے۔ ادھر کئی برسوں سے جدیدیت، شاعری اور نئی شعریات کے مباحث پیدا ہوئے ہیں۔ شروع شروع میں یہ مسایل انتہائی کھردرے اور الجھے ہوئے تھے اور نئی شاعری کی آڑ میں اچھے شعری نمونوں کے ساتھ ساتھ ناقص، کھردرے اور غیر شعری نمونے بھی سامنے آئے۔ جہاں اس کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار ہوا وہاں بعض حلقوں میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ لیکن حامدی نے جدید شاعری اور نئی شعریات کے مباحث کا معروضی طور پر مطالعہ کیا اور نئے شعری احساس اور جذبے کی دید و دریافت کے ساتھ عصری حسیت کی اصل اور اس کے مباحث کا احاطہ کیا۔ کارگہہ شیشہ گری میں میر کی شاعری میں پوشیدہ تخیلی کائنات میں حسیاتی اور علامتی پیکروں کی تلاش اور ان کی معنویت کا مطالعہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر حامدی کے دوسرے تنقیدی کارناموں میں "کارگہہ شیشہ گری اور ناصر کاظمی کی شاعری" ہے۔ کارگہہ شیشہ گری میں میر کی شاعری میں پوشیدہ تخیلی کائنات میں حسیاتی اور علامتی پیکروں کی تلاش اور ان کی معنویت کا مطالعہ ملتا ہے اور ناصر کاظمی کی شاعری

بھی ایسا ہی معروضی مطالعہ پیش کرتی ہے۔ حامدی کی تنقیدوں کا مطالعہ کرنے سے اردو تنقید میں ایک نئی آواز کا احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر حامدی آج کل اردو تنقید کا محاسبہ کرتے ہوئے ایک نئے انداز نظر سے ایک اور کتاب لکھ رہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ان کے تنقیدی مضامین کا نیا مجموعہ "امکانات" شایع ہوا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد ابھرنے والے محققین میں ڈاکٹر اکبر حیدری کا نام بھی اہم ہے۔ حیدری صاحب بنیادی طور پر محقق ہیں اور تنقید ان کا میدان نہیں۔ انہوں نے محققانہ جگر کاوی سے مرثیہ، تذکرہ اور کلاسکی شعر و نثر کے لئے شمار و فینوں کو کھنگھالا ہے۔ جن پر شاید زمانہ کی دھول پڑی تھی۔ ان کے کئی تحقیقی کارنامے اردو ادب میں مستقل عنوان رکھتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنی تحقیقات میں تنقیدی خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ جس سے ان کی تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔

ہمارے ایک بالغ نظر نقاد محمد یوسف ٹینگ ہیں۔ وہ کشمیری اور اردو ادبیات کے سنجیدہ قاری ہیں اور دونوں پر ان کی گہری نظر ہے ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ شناخت ابھی چند برس پہلے شایع ہوا۔ لیکن ریاست اور ملک کے معتبر رسایل میں ان کے مضامین اور خاص طور پر تنقیدی مضامین برسوں سے شایع ہو رہے ہیں۔ ٹینگ صاحب عرصہ دراز تک صحافت کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔ شمیم مرحوم کے ساتھ وہ تعمیر کے ساتھ وابستہ تھے اور ان دونوں ادیبوں کی مساعی سے تعمیر نے پورے ملک میں باوقار مقام بنالیا تھا۔ اس کے بعد ٹینگ صاحب ریاستی کلچرل اکادمی کے مجلہ "شیرازہ" اور "ہمارا ادب" کے مدیر رہے اور ان کو وقار اور مقام بخشا۔ آج شیرازہ اور ہمارا ادب ہندوستان کے سنجیدہ ادبی حلقوں میں قدر اور تحسین کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اس منزل تک پہنچانے میں محمد یوسف ٹینگ

کا ہاتھ ہے۔ اپنے منصبی فرائض سے قطع نظر ٹینگ ایک معتبر ادیب اور ناقد ہیں۔ شیرازہ کے اداریوں کے علاوہ ریاست کے ادیبوں اور مصنفوں کی کتابوں پر ان کے مقدمے اور دیباچے ان کی وقتِ نظر کا ثبوت ہیں۔ ٹینگ بطور خاص کشمیریات سے دلچسپی رکھتے ہیں اور کشمیر کے آرٹ، ادب، کلچر، تاریخ اور دوسرے ثقافتی پہلوؤں پر ان کے مضامین دستاویزی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوصف غالب، اقبال، منٹو، اور کشمیر میں اردو کے تعلق سے ان کے بعض مضامین نہ صرف ان کی دیدہ وری، ان کی ریاضت اور محققانہ جگر کاوی کا ثبوت ہیں۔ بلکہ ان کے مطالعے سے ان کی تنقیدی بصیرت اور معروضی انداز نظر کا قایل ہونا پڑتا ہے۔ ان کے بات کہنے کا انداز شگفتہ، مدلل اور سوچ و فکر کو متحرک کرنے والا ہے۔

ڈاکٹر محمد زمان آزردہ ہمارے ایک اور محقق اور ناقد ہیں۔ ان کا بنیادی میدان بھی تنقید سے زیادہ تحقیق ہے۔ زمان کافی دنوں سے لکھ رہے ہیں۔ ان کا تحقیقی مقالہ مرزا سلامت علی دبیر۔ حیات اور کارنامے ایک قابل قدر مقالہ ہے۔ اس میں حیات دبیر کے بعض ایسے گوشے تلاش کئے گئے ہیں۔ جو زمانے کے شدایڈ سے گوشہ تاریکی میں دفن تھے۔ زمان نے دبیر کے غیر مطبوعہ کلام اور دوسری کاوشوں کو دریافت کیا ہے اور دبیر کے اصلی اور الحاقی کام کی نشان دہی کی ہے جس سے دبیر اپنی پوری تابانی کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ اور ان کے صحیح مرتبے کی پہچان ہو جاتی ہے۔ زمان کے سنجیدہ اسلوب نے مقالے میں جان ڈالی ہے۔ مرثیے کے تنقیدی حصے سے قطع نظر زمان نے ایک اہل نظر ناقد ہونے کا بھی ثبوت فراہم کیا ہے۔ مرثیہ کی تنقیدی تاریخ میں اور خاص طور پر دبیر کے حوالے سے اس مقالے کی ہمیشہ قدر ہوگی۔ زمان برسوں سے مختلف سنجیدہ موضوعات کی طرف بھی متوجہ ہوئے ہیں۔ پریم ناتھ در کی افسانہ نگاری، اقبال کا تصور عشق کشمیر کے اردو

ادیب، پریم چند کی حقیقت نگاری، تنہا انصاری بحیثیت اردو شاعر اور ایسے ہی متعدد تنقیدی مضامین ملک کے مختلف رسایل میں شایع ہوئے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمان اب تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید کو بھی اپنی جولاں گاہ بنا رہے ہیں۔ تحقیق و تنقید کے شعبے میں راقم السطور کی چار کتابیں منظر عام پر آئی ہیں (۱) حرف جستجو (۲) جلوۂ صد رنگ (۳) سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے "ذوق نظر" اس کے علاوہ ملک کے مختلف رسایل میں تنقیدی مضامین آئے دن شایع ہو رہے ہیں ان کتابوں اور مضامین میں راقم کے مشاہدے، مطالعے اور تلاش و جستجو کی چند کیفیتیں شامل ہیں۔ جو راقم السطور کے ذہنی رویے کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ مضامین اردو فکشن کے بعض اہم فن کاروں کے تخلیقی عمل کے بعض پہلوؤں اور اردو ادب سے متعلق بعض مسایل اور مباحث کا احاطہ کرتے ہیں راقم نے لبساط بھر خلوص اور ادبی دیانت کے ساتھ اظہار خیال کی حقیر کوشش کی ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا تعین راقم کے قارین ہی صحیح معنوں میں کر سکیں گے۔

خطہ جموں سے تعلق رکھنے والے بعض فاضل دوستوں نے اردو تنقید کی آبیاری کی ہے۔ ان میں ڈاکٹر شیام لال کالرا (عابد پشاوری) ڈاکٹر منظر اعظمی، ڈاکٹر ظہور الدین اور پروفیسر کنول کرشن بالی خاص طور قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر کالرا کو کلاسیکی ادب سے خاص دلچسپی ہے۔

انہوں نے بطور خاص انشا کی نثری خدمات پر کام کیا ہے۔ ڈاکٹر کالرا کی انشا سے متعلق تصانیف سے ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا احساس ہوتا ہے ان کی تصانیف اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر ظہور نے کئی تنقیدی کتابیں تصنیف کی ہیں ان کا تحقیقی مقالہ بہت پہلے چھپ چکا ہے بیسویں صدی کے اردو ادب میں انگریزی رجحانات "نہ صرف محققانہ جگر کاوی

کا ثبوت ہے۔ بلکہ ظہور نے معروضی انداز سے ان رجحانات کا تجزیہ کیا ہے اور دلایل دیکر ان رجحانات کی نشاندہی کی ہے۔ ظہور کا انداز متوازن اور سلجھا ہوا ہے۔ اردو ڈرامے کے تعلق سے ان کی مزید دو کتابیں چھپ رہی ہیں۔ جن میں اردو ڈراما کے بعض نئے پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر منظر اعظمی ایک اور ناقد ہیں۔ اردو میں تمثیل نگاری، تلاش و تعبیر، سب رس کا تنقیدی جائزہ وغیرہ ان کے متعدد تنقیدی کارنامے ہیں۔ منظر کی شگفتہ تحریروں میں ایک صاحب بصیرت ناقد کی روح جھلکتی ہے۔ وہ صاف سلجھے اور ستھرے ہوئے انداز میں اپنی بات منواتے ہیں۔ کنول کرشن کی تصنیف "آزاد نظم اور اردو شاعری" اپنے موضوع کی مطابقت سے اچھی کتاب ہے۔

ریاست کے دوسرے اہم ناقدوں میں پروفیسر پشپ، پرنسپل جے لال کول محی الدین قاضی، تنہا انصاری، رحمان راہی، ڈاکٹر شمس الدین احمد، ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتا، امین کامل، غلام رسول نازکی، قیصر قلندر، موتی لال ساقی، بلدیو پرشاد شرما، رشید نازکی نیلامبر دیو، محمد عبداللہ شیدا، اوتار کرشن رہبر، مرغوب بانہالی، امرمالموہی، نشاط انصاری، مشعل سلطانپوری، سیف الدین سوز، شانتی سروپ نشاط، عشرت کشتواڑی، عبدالغنی شیخ، عبدالاحد رفیق، اسداللہ وانی، ڈاکٹر تہمینہ اختر، محمد امین اندرابی، محمد احمد اندرابی ارجن دیو مجبور ہیں ان میں سے بہت سے اہل نظر ایک زمانے سے لکھ رہے ہیں۔ اگرچہ ان کے مضامین کتابی صورت میں شایع نہیں ہوئے ہیں۔ بعض لوگ نسبتاً بعد میں آئے۔ لیکن یہ بات مسلم ہے ان ادیبوں اور نقادوں نے شعر و ادب کے مختلف پہلوؤں پر قلم آزمائی کی ہے اور بہت سے مسایل پر فکر انگیز مقالے لکھے ہیں۔ جن سے ان کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان مضامین نے مجموعی طور پر ہمارے تنقیدی ادب کے سرمائے میں توسیع کی ہے۔

نئی نسل سے تعلق رکھنے والے بعض نوجوان بڑی صلاحیتوں کے مالک

ہیں۔ جن لوگوں نے تنقید کے شعبے کو اپنایا ہے ان میں پرمی رومانی مجید مضمر، اقبال فہیم، یوسف سلیم، منیب الرحمٰن چند اہم نام ہیں۔ پرمی رومانی نے چند سال قبل "جدید اردو شاعری چند مطالعے" کے عنوان سے اپنا اولین تنقیدی مضامین کا مجموعہ شایع کیا۔ جدید تر شعرا کا یہ معروضی مطالعہ پہلی بار سامنے آیا۔ چند کوتاہیوں کے باوصف ملک کے سنجیدہ ادبی حلقوں میں اسے پسند کیا گیا۔ ان کے تنقیدی مضامین کا نیا مجموعہ "اوراق" ابھی شایع ہوا ہے۔ اقبال فہیم کی تحریروں میں نئے ذہن کی آگہی ہے ان کا لہجہ اگرچہ جارحانہ ہوتا ہے لیکن ادب کے مسایل پر ان کی نظر ہے وہ بے باکی سے اظہار خیال کرتے ہیں۔ مجید مضمر نے علامتی افسانے پر کام کیا ہے۔ ان کے متعدد تنقیدی مضامین شایع ہو چکے ہیں جن سے ان کی تنقیدی سوجھ بوجھ کا پتہ چلتا ہے۔ یوسف سلیم وجودیت کے فلسفے سے متاثر ہیں اور اردو شاعری میں ان ہی اثرات کو تلاش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے کئی اچھے مضامین شایع ہو چکے ہیں۔

اردو تنقید کی توسیع میں جموں اور کشمیر یونیورسٹی کے اردو شعبہ جات، کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ، ریاستی کلچرل اکادمی، دوردرشن اور ریڈیو جموں کی مساعی کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمام ادارے وقتاً فوقتاً اپنے سیمیناروں مباحثوں اور مختلف توسیعی تقریروں کے ذریعے سے اردو تنقید کی نئی جہتوں کی طرف نشان دہی کرتے رہے ہیں۔ جہاں بحث و تمحیص کے ذریعے مسایل کے نت نئے پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے رسایل بنا شعور، ادبیات اور بازیافت، اقبال انسٹی ٹیوٹ کے مجلہ اقبالیات اور دوسرے کتابی سلسلوں ریاستی کلچرل اکادمی کے "شیرازہ" اور ہمارا ادب، محکمہ اطلاعات کے "تعمیر" کے ذریعے بھی برسوں سے اچھا کام ہو رہا ہے۔ ان رسالوں میں علمی اور تحقیقی مضامین

کے علاوہ خاصی تعداد میں تنقیدی مضامین بھی شایع ہوتے ہیں۔ ان کے مضمون نگار مقامی
ادباء کے علاوہ ملک کے قدآور ادیب اور نقاد اپنے مضامین شایع کرواتے
ہیں۔ یہ مضامین بلند معیار کے ہوتے ہیں۔ شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی میں تحقیق اور تنقید
کے شعبوں میں برسوں سے گراں قدر کام ہورہا ہے ان تمام کارناموں کا تفصیل سے
ذکر کرنے کا یہاں محل نہیں۔ البتہ چند مقالوں کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔ جن سے یقیناً
اردو تنقید کے شعبے میں توسیع ہوئی ہے۔ ان میں بعض مقالے شایع ہو چکے ہیں
بعض ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ ان میں خصوصی طور پر ڈاکٹر اسداللہ کامل کا اردو میں سیرت النبی
کا ادب' ڈاکٹر نذیر احمد ملک کا اردو رسم خط کا ارتقاء اور جائزہ اور ڈاکٹر محبوبہ وانی
کا" اردو اور کشمیری شاعری میں رومانی رجحانات قابل ذکر ہیں۔ یہ مقالے اگرچہ
بنیادی طور پر تحقیقی ہیں لیکن ان میں تنقید کے منصب سے بھی عہدہ برآ ہونے کی
کوشش ملتی ہے۔ ڈاکٹر نذیر ملک کا مقالہ اس لئے بھی اہم ہے کہ ریاست میں
لسانیاتی موضوع پر ڈاکٹر اسد ھیشو رورما کے بعد پہلا مقالہ ہے جو یہاں لکھا گیا
ہے۔ ڈاکٹر محبوبہ وانی نے اردو کشمیری شاعری کے رومانی رجحانات تلاش کیے ہیں۔
بلکہ ان کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے اپنی تنقیدی سوجھ بوجھ کا ثبوت فراہم کیا ہے
ڈاکٹر عبدالقدوس جاوید کی تصنیف ادب اور سماجیات میں بعض تنقیدی مباحث
ملتے ہیں۔ جموں یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے زیر اہتمام بھی کئی گراں قدر مقالے
لکھے گئے جن میں سے بعض تو شایع ہو چکے ہیں اور بہت سے مقالے ابھی غیر
مطبوعہ ہیں۔ ان میں ڈاکٹر تہمینہ اختر کا اردو ادب میں گاندھیائی اثرات اور علی عباس
حسینی کا فن۔ ڈاکٹر محمد اقبال کال احمد حیات اور کارنامے' سردار کرتار سنگھ
کا بیدی کا فن' اسداللہ وانی کا جموں وکشمیر میں اردو افسانہ ۱۹۴۷ء کے بعد وغیرہ اس
کے علاوہ دونوں شعبوں میں اس وقت تک درجنوں اہم تنقیدی کارنامے انجام

دیئے گئے ہیں۔

کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں برصغیر کے نامور نقاد پروفیسر آل احمد سرور کی بصیرت افروز رہنمائی میں گراں قدر کارنامے انجام دیئے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کے جریدے اقبالیات میں ملک بھر کے معروف اہل نظر کے مضامین شایع ہوتے ہیں اور اقبال کے فکر و نظر کے نئے گوشے سامنے آرہے ہیں۔ اس جریدے میں دوسرے موضوعات پر بھی تنقیدی مضامین شایع ہوتے ہیں۔ اسی انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ہر سال قومی اور بعض اوقات بین الاقوامی سطح پر سمینار منعقد ہوتے ہیں۔ جن میں ملک کے بڑے بڑے عالم اور نقاد شریک ہوتے ہیں اور مقالے پڑھتے ہیں جن پر بحث و تمحیص ہوتی ہے۔ یہ مقالے انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام کئی کتابی سلسلوں میں شایع ہوکر منظر عام پر آئے ہیں۔ اردو تحقیق و تنقید کو بالعموم اور اقبالیات کو بالخصوص اس مطبوعہ مواد سے فایدہ ہوا ہے۔ اردو تنقید میں یقیناً اقبال انسٹی ٹیوٹ کی اس مساعی سے اضافہ ہوا ہے۔

ریاستی کلچرل اکادمی کی سرگرمیوں میں اردو ادب کی خدمات بھی شامل ہیں۔ اکادمی نے اپنی مختلف کارگزاریوں کے درمیان میں اردو ادب کو فراموش نہیں کیا ہے۔ اس سلسلے میں دوسری سرگرمیوں کے علاوہ اس کے اشاعتی پروگرام میں اردو کے مصنفین کو مالی معاونت اور اپنے جراید شیرازہ اور ہمارا ادب کی اشاعت بھی شامل ہے۔ اس طرح سے ادب کے دوسرے شعبوں کی طرح اردو تنقید کے ذخیرے میں اضافہ ہو رہا ہے۔ گزشتہ برسوں میں دوسرے اہل قلم کی طرح اردو کے کئی ناقدین کی تنقیدی کتابیں اکادمی کے مالی اشتراک سے سامنے آئی ہیں۔ اس کے علاوہ اکادمی نے از خود کئی تنقیدی کارناموں کو شایع کیا ہے۔ آخر میں ان عالموں، فاضلوں، دانش وروں، محققوں اور نقادوں کا ذکر کرنا

ضروری ہے۔ جن کا تعلق اگرچہ اس ریاست سے نہیں مگر یہ حضرات اردو ادب کی آبرو ہیں۔ اردو دنیا میں کون ایسا کور ذوق ہوگا جو ان سے اور ان کے کارناموں سے واقف نہیں ہے۔ یہ حضرات برسوں سے ہمارے درمیان موجود ہیں اور بعض حضرات ابھی تک یہاں اقامت پذیر ہیں۔ یہیں انہوں نے کئی تنقیدی کارنامے انجام دیئے جن سے اردو دنیا نے راہ اور روشنی پائی۔ پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی، جعفر علی خان اثر، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر زور، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر شکیل الرحمن، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر گیان چند جین، پروفیسر عالم خوند میری، ڈاکٹر جعفر رضا، مظہر امام وغیرہ کے کارناموں سے اردو ادب کا کون قاری واقف نہیں۔

ان مقتدر عالموں اور نقادوں میں آل احمد سرور، شکیل الرحمن اور جگن ناتھ آزاد کا قیام نسبتاً طویل ہے۔ سرور صاحب اردو تنقید کی سب سے بلند قامت شخصیت ہیں۔ ان کے سایے میں اردو ادبی تنقید کے بال و پر نکل آئے۔ اردو تنقید کے کئی دبستان ابھرے لیکن سرور صاحب کی آواز مختلف اور منفرد رہی۔ انہوں نے ہر بدلتے ہوئے لہجے کو ہمدردی اور خلوص سے دیکھا اور پرکھا۔ اسلئے وہ قدیم و جدید دونوں طرح کے نظریات اپنانے والوں کے قریب ہیں۔ وہ صرف اقبالیات کے ہی ماہر نہیں۔ ادب کے بیشتر شعبوں پر وہ ماہرانہ نظر کے مالک ہیں اور یہ امتیاز بہت کم لوگوں کو حاصل ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمن کا وطن ثانی کشمیر ہے۔ شکیل صاحب کا شعور اس سرزمین میں نکھرا اور ان کے تنقیدی نظریات کی تعمیر و تشکیل یہیں پر ہوئی۔ شکیل صاحب بنیادی طور پر ناقد ہیں۔ لیکن ان کے تنقیدی نظریات نفسیات، جمالیات اور اساطیر پر استوار ہیں۔ وہ اپنے لہجے اور طرز فکر سے اردو کے منفرد ناقد ہیں۔ ایک طرف ان

کی تنقید کے ڈانڈے فرایڈ، ایڈلر، یونگ، ارک فردم اور دوسرے مغربی ماہرینِ نفسیات کے نظریات سے ملتے ہیں اور دوسری طرف وہ جمالیات اور خاص طور پر ہندوستانی جمالیات کے عاشق ہیں اور ان کی فکر و نظر کے سوتے یہیں سے پھوٹتے ہیں۔ ان کی اہم تصانیف میں ادبی قدریں اور نفسیات، لاوے کا سمندر، اقبال، روشنی کی جمالیات، غالب کی جمالیات، فیض کی شاعری، زبان اور کلچر قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد اقبال کے عاشق ہیں۔ وہ برصغیر کے معدودے چند ناقدوں اور عالموں میں سے ہیں جن کا اقبال پر سب سے زیادہ کام ہے۔ ان کی اہم تصانیف میں اقبال اور کشمیر، اقبال اور مغربی مفکرین، محمد اقبال ایک ادبی سوانح، نشانِ منزل وغیرہ ہیں۔ آزاد صاحب نے اقبال کے فکر و فن کے کئی ایسے پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی جو گوشۂ تاریکی میں پڑے ہوئے تھے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ تنقید کے شعبے میں ہمارے کارنامے نہایت قلیل ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں۔ جن کو اردو ادبیات کا کوئی سنجیدہ قاری صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ اور یہی کیا کم ہے۔

٭٭٭٭٭٭٭٭

# جموں و کشمیر میں اُردو ڈراما

اردو میں ڈراما مجموعی حیثیت سے کافی تاخیر کے بعد پیدا ہوا۔ اس لئے اس کی تاریخ مختصر ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مجموعی حیثیت سے ابھی اردو میں باقی اصناف کے مقابلے میں کوئی قابلِ قدر ڈراما پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ اس نظریئے سے دیکھیں تو ریاست جموں و کشمیر میں اردو ڈراما کی کمی یا دوسرے اصناف کے مقابلے میں اس صنف کی پس ماندگی قابلِ فہم ہے۔ لیکن اس کمی کے باوصف، کشمیر میں ڈراما کی روایت سے انکار کرنا بھی ممکن نہیں۔ جب بھی مجموعی حیثیت میں اردو ڈراما کے اجزائے ترکیبی یا عناصر خمسہ سے بحث ہوتی ہے تو بھانڈوں کی نقلوں کا ذکر بھی ضرور آتا ہے۔ جب ہندی اور قدیم سنسکرت ڈرامے کو زوال آیا اور اسٹیج تقریباً ختم ہوا تب پیشہ ور عام اداکاروں نے نقالی یا بھانڈ پن شروع کیا۔ اردو ڈراما کے مشہور محقق اور ناقد عشرت رحمانی نے مُلا غنیمت کاشمری کی مثنوی نیرنگ خیال

کے حوالے سے کشمیری بھانڈوں کا ذکر کیا ہے جو اورنگ زیب کے عہد میں گانے بجانے اور نقلیں کرنے اور سوانگ رچانے کا کام بطور پیشہ کے کرتے تھے اور بازاروں میں گھوم کر تماشائیوں کو جمع کرتے اور نقلیں دکھا کر روزی کماتے تھے۔ یہ بھانڈ کشمیر سے آئے تھے اور گانے بجانے اور نقالی میں بڑی قدرت رکھتے تھے۔ امراء و رؤسا کے یہاں شادی بیاہ اور دوسرے تہواروں کے موقعوں پر جا کر اپنا کرتب دکھاتے تھے۔ ان کو بھگت باز بھی کہا جاتا تھا۔ لکھنؤ میں ایسے بہت سے خاندان بس گئے تھے۔ یہ جس طرح کی نقلیں دکھاتے تھے۔ ان میں چھوٹے موٹے مزاحیہ واقعات سنائے جاتے تھے، جس میں تفریح کا پہلو موجود ہوتا تھا۔

بھانڈ بہروپ بدلنے میں بھی ماہر تھے اور بڑے حاضر جواب بھی تھے۔ ان کے خوبصورت لڑکے زنانہ کردار ادا کرتے تھے۔ شاہی محفلوں میں بھی یہ لوگ اپنے کرتب کا مظاہرہ کرتے تھے۔ نقلوں کی ان محفلوں کو ڈرامے کے زمرے میں شامل نہ کرتے ہوئے رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ڈرامے کی تشکیل و تہذیب میں ان محفلوں کا اہم رول رہا ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بھانڈ جو کشمیری الاصل تھے۔ بہت پہلے اس فن سے واقف تھے۔ مکالموں کی ادائیگی میں ان کا عمل خاص طور پر قابلِ دید تھا۔ مکالمے کسی تیاری کے بغیر برجستہ اور فی البدیہہ ادا کرتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گفتار کے تحرک میں یقین رکھتے تھے اور مکالموں کے ساتھ ساتھ اپنے سارے جسم کو حرکت میں لاتے تھے اور یہی ڈراما کا فنی منصب بھی ہے۔

بھانڈ پا تھر یا بھانڈ جشن جس کا اوپر ذکر ہوا دراصل یہاں کا عوامی ڈراما تھا۔ جس طرح ہندی ڈرامے کا ذکر کرتے ہوئے جگہ جگہ گھومنے والی ناٹک منڈلیوں کا ذکر ناگزیر ہے۔ اسی طرح کشمیر میں ڈرامے کا ذکر کرتے ہوئے ان ناٹک منڈلیوں

کا ذکر ضروری بنتا ہے۔ یہ فنکار جگہ جگہ اور گاؤں گاؤں گھوم کر زمانے کے تقاضوں کے مطابق لوگوں کے لئے تفریح کا سامان مہیا کرتے تھے۔ اور روحِ عصر کو رمز و علایم میں پیش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ روزی روٹی کے مسئلے کو بھی حل کرتے تھے۔ یہاں یہ کہنا بے جا بھی نہیں ہوگا کہ بھانڈ مسخرے کو کہتے ہیں اور پاتھر کے معنی ہیں کسی شخص کی حرکات کی نقالی کرنا بھانڈ پاتھر کا بنیادی مقصد بھی سماجی طنز یا تھا۔ طنز کے ساتھ مزاح کا بڑا تعلق ہے۔ اسلئے بھانڈ پاتھر تفریح کا بڑا ذریعہ تھا۔ یہ ایک چلتا پھرتا اسٹیج تھا اور جیسا کہ ذکر ہوا ناٹک منڈلی یا نوٹنکی دکھانے والی منڈلی کی طرح کا تھا اور اس کا یہی منصب تھا جو ابتدائی دور میں ہندوستان کے عوامی تھیٹر کا تھا۔

زمانہ قدیم میں بھی ہمارے یہاں رقص کی محفلوں کا چلن رہا ہے۔ اس کا تعلق بھی نہ کسی صورت میں ڈرامے کے ساتھ ہے۔ کلہن نے اندر پربھا نام کی ایک رقاصہ کا ذکر کیا ہے جس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ عہدِ بدشاہی میں بھی فنِ ڈراما کی طرف توجہ ہوئی چنانچہ یودھ بٹ اور سوم پنڈت کا ذکر ہماری تواریخوں میں ملتا ہے جنہوں نے سنجیدہ ڈرامے لکھے۔

ابھی اوپر کی سطور میں کشمیر کے بھانڈ پاتھر کا ذکر ہوا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں ڈرامے کو لوگوں کی سرپرستی ملی۔ جموں میں خاص طور پر رام لیلا کا تہوار منایا جاتا تھا اور اس طرح سے اردو ڈرامے کے عناصر ترکیبی میں اس کی وہی اہمیت ہے جیسی قدیم اردو ہندی ڈرامے میں لیلاؤں اور نیلاؤں کا ہے لیکن بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی اس شعبے میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوئیں اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دورِ حکومت میں ریاست کے باہر سے متعدد راس لیلا پارٹیاں ریاست میں آنا شروع ہوئیں۔ شروع شروع میں ایسے ڈراموں کا مقصد مذہبی قصے

کہانیوں کو ڈرامائی شکل میں پیش کرنا تھا۔ بعد میں آہستہ آہستہ سماجی مسائل شامل کیے جانے لگے اور ڈراما لیلاؤں اور نیلاؤں کے اثر سے باہر آنے لگا۔ اس زمانہ میں پارسی تھیٹر کی دھوم تھی اور آغا حشر کاشمیری، بیتاب بنارسی، طالب بنارسی، ماسٹر رحمت علی، احسن لکھنوی جیسے ڈرامانگاروں نے ہندوستانی تھیٹر میں تہلکہ مچایا تھا۔ چنانچہ شروع میں جموں شہر اور بعد میں سری نگر شہر میں مختلف تھیٹر کمپنیوں کی آمد شروع ہوئی جنہیں ڈوگرہ مہاراجوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ چنانچہ مشہور انگریزی بنگالی ہندی ڈرامانگاروں کے اہم ناٹک اردو کے توسط سے پیش ہوئے۔ ریاست کے بہت سے بامذاق جنہیں ہندوستان کے مختلف شہروں میں جانے کا موقعہ فراہم ہوا تھا۔ ہندوستانی تھیٹر میں بعض ڈرامے دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ ان کے دل میں بھی اسٹیج استوار کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اسلئے جب راس لیلا پارٹیاں جموں اور سری نگر آکر ڈرامے اسٹیج کرنے لگیں اور انہیں مقبولیت حاصل ہوئی۔ تو ہمارے نوجوانوں نے بھی اس شعبے میں اپنی صلاحیتیں آزمانے کے مواقع تلاش کیے۔ اس سلسلہ میں بنیادی کوششیں جموں میں ہوئی جہاں محمد عمر نور الٰہی صاحبان کی جوڑی نے اسٹیج اور ڈراما کے ساتھ اپنی بے پناہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ انہوں نے نہ صرف خود ناٹک لکھے بلکہ اردو زبان میں ڈراما کی پہلی تاریخ اور تنقید ناٹک ساگر کے عنوان سے لکھی جو ۱۹۲۴ء میں لاہور سے شایع ہوئی۔ یہ کتاب آج تک اردو ڈرامائی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان دونوں حضرات نے اس زمانے میں کئی ڈرامے تصنیف اور تالیف کیے۔ بعض ڈرامے دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں اور کئی طبع زاد ان کے ڈراموں میں حسب ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تین ٹوپیاں، بگڑے دل، ظفر کی موت، روح سیاست، سات ڈرامے، سروپ وغیرہ۔ ان دونوں دوستوں نے ہندی اور سنسکرت اور پراکرت کے بعض ڈراموں کو بھی اردو لباس پہنایا۔ اس سلسلہ

میں امدرار اکھشن خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ان میں سے بیشتر ڈرامے تاریخی نوعیت کے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں خطۂ کشمیر کے دینا ناتھ وار یکو شاید نے رکمنی ہرن کے عنوان سے ایک ڈراما لکھا جو اخبار مارتنڈ میں بالاقساط شائع ہوتا رہا لیکن اسٹیج نہ ہو سکا۔

خطۂ جموں سے تعلق رکھنے والے ڈرامانگاروں میں جگدیش کنول، آذر عسکری، عزیز کاش بھی قابلِ ذکر ہیں۔ جنہوں نے پردے کے پیچھے، چار سو بیس، نوشتۂ تقدیر جیسے ڈرامے لکھے اور آزادی سے قبل اس صنف میں اپنا مقام بنایا۔

کشمیر میں بیسویں صدی کے آغاز سے ہی مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں ناٹک کمپنیاں پہنچ چکی تھیں اور یہاں کے لوگوں کو بھی راس لیلا طرز کے ڈرامے پیش کرنے کی اُمنگ پیدا ہوئی تھی چنانچہ گاؤکدل کے نواح میں ایک اسٹیج کا اہتمام کیا تھا اور ایک پیشہ ور ڈراما کمپنی وجود میں آئی۔ اس کمپنی کے زیرِ اہتمام کئی ڈرامے اسٹیج ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کمپنی میں زنانہ رول ادا کرنے کے لئے ریاست سے باہر کی کچھ اداکارائیں بھی ملازم تھیں لیکن افسوس یہ کمپنی زیادہ دنوں تک چل نہ سکی۔ بعض سیاسی اور سماجی حالات اس کمپنی کی کارکردگی میں سدِ راہ ثابت ہوئیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس ڈراما کمپنی کی باگ ڈور دھرم ارتھ محکمے نے سنبھالی تھی۔ جس کے ملازمین آپسی تضادات کے شکار ہوئے۔ لہٰذا کمپنی کا شیرازہ جلد ہی بکھر گیا اور تھیٹر اور اسٹیج کی جس تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ وہ مدھم پڑ گیا۔ لیکن جموں خطے میں صورتِ حال بہتر تھی۔ وہاں ڈرامانے کئی نئی منزلیں طے کیں۔

جموں وکشمیر میں تھیٹر کی تحریک کو آگے بڑھانے میں IPTA (اپٹا) کا بڑا رول رہا ہے۔ عوامی تھیٹر کی تحریک سے وابستہ مشہور دانش ور اداکار بلراج ساہنی کے ایما پر انڈین پیپلز آرگنائزیشن اپٹا (IPTA) کی ایک شاخ یہاں بھی منظم کرنے کی کوشش ہوئی۔ اس کے لئے کہانی کار پریم ناتھ پردیسی مرحوم نے اپنا ڈرامہ

"بتہ ہر" لکھا تھا۔ جو کشمیری زبان میں تھا۔ لیکن ڈرامہ سرکاری عتاب کا شکار ہوا اور اسے ضبط کیا گیا۔ لیکن یہ قدم یہاں کی اسٹیج کی تحریک کے لئے فعال ثابت ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا۔ اور پاکستان وجود میں آگیا۔ پورے ملک میں خوشی کے ساتھ آنسوؤں کا سیلاب آیا۔ ملک کے بٹوارے کے ساتھ ساتھ سامراجی قوتوں کی شہ پر فرقہ دارانہ فسادات رونما ہوئے۔ جس نے اور باتوں کے علاوہ ہماری ثقافتی زندگی کو بھی متاثر کیا۔

کشمیر آگ اور خون کے اس رقص سے دامن بچا نہ سکا۔ کشمیر پر قبائلی حملہ ہوا۔ یہاں کا ڈوگرہ تاج دار مہاراجہ ہری سنگھ اپنی رعایا کو نہتہ اور بے بس چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس زمانے میں کشمیری عوام نے نیشنل کانفرنس کی سربراہی میں کشمیر چھوڑ دو کی تحریک شروع کی تھی چنانچہ حکومت کی عنان نیشنل کانفرنس کے ہاتھ میں آگئی جس کے سربراہ شیخ محمد عبداللہ تھے۔ ایسے وقت میں چاروں طرف موت کا خونین رقص ہو رہا تھا۔ ہمت اور حوصلے کی ضرورت تھی۔ اس کو برقرار رکھنے کے لئے ریاست کے دانشور ادیب شاعر اور فنکار سامنے آئے چنانچہ انہوں نے ایک ثقافتی محاذ کلچرل فرنٹ کے نام سے تشکیل دیا۔ یہ فرنٹ ایک طرح سے اپٹا کی توسیع تھی۔ اس فرنٹ نے علاوہ اور کارناموں کے اسٹیج اور ڈرامے کی تحریک کا احیائے نو کیا۔ باضابطہ طور پر ڈرامے لکھے جانے لگے اور اسٹیج ہونے لگے۔ کلچرل فرنٹ بعد میں آل سٹیٹ کانگریس میں تبدیل ہوا۔ اس کے تین شعبے تھے۔ (۱) ادیبوں اور شاعروں کا شعبہ (۲) مصوروں کا شعبہ (۳) تھیٹر کا شعبہ۔ چنانچہ اسٹیج سے پیش کیا جانے والا پہلا ڈراما "کشمیر یہ ہے" تھا۔ جو اس وقت کے مشہور ادیب پروفیسر محمود ہاشمی نے لکھا تھا۔ یہ ڈراما بہت مقبول ہوا اور یہاں کے تھیٹر اور ڈراما کی تحریک میں اس کی حیثیت سنگ میل کی ہے۔ اس میں پہلی بار مرد اور زنانہ فنکاروں

نے کام کیا تھا۔ یہ ڈراما اردو زبان میں پیش کیا گیا لیکن اس کے گانے کشمیری زبان
میں لکھے گئے تھے اور اس کی پوری فضا کشمیری تھی۔ تھیٹر کے ساتھ تعلق رکھنے والے
پریم ناتھ پردیسی، محمود ہاشمی، راج ہنس کھنہ، دینا ناتھ نادم، علی محمد لون، قیصر قلندر،
صلاح الدین احمد، گردھاری دھر، پران کشور، اوشا کشپ، موہن لال ایما، ٹیلا بھاٹیہ،
مکھوارا بہنیں اور کئی لوگ تھے۔ محمود ہاشمی نے اس زمانہ میں کئی ڈرامے لکھے۔ اس
کے سربراہوں میں شیو دھان سنگھ چوہان قابل ذکر تھے۔

پریم ناتھ پردیسی نے بھی اس زمانے میں ڈرامہ نگاری کی طرف توجہ کی۔ اس زمانے
میں ریڈیو کشمیر سری نگر بھی وجود میں آگیا تھا۔ چنانچہ کئی ڈرامے اسٹیج بھی ہوئے اور نشر
بھی، پردیسی کے ایسے ڈراموں میں مجاہد، شیروانی اور سوالی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ابھی اوپر کی سطور میں سٹیٹ کلچرل کانگریس کا ذکر ہوا۔ جس کی سرپرستی میں کئی ادبی
اور ثقافتی سرگرمیاں روبہ عمل آئیں۔ چنانچہ خواجہ احمد عباس کا مشہور ڈرامہ "چودہ گولیاں"
اسی زمانہ میں کلچرل کانگریس کے اسٹیج سے پیش ہوا۔ اس دوران پردیسی نے
قدہ گوجاری نام کا اردو ڈراما لکھا جسے کشمیری میں منتقل کرکے پیش کیا گیا۔ یہ
رواداری اور قومی یک جہتی کے سلسلے میں لکھے گئے ڈراموں کی اولین کڑی تھی۔

تھیٹر کی پوری تحریک اور اردو ڈرامے کی تاریخ میں یہ سنہری دور ہے، کیونکہ
اس کے ڈراما اور اسٹیج کے لئے ایک نیا راستہ کھول دیا۔

ریاست جموں وکشمیر میں ڈرامے کی صنف میں ۱۹۴۷ء کے بعد خاص طور
پر توسیع ہوئی۔ جموں اور سری نگر دونوں جگہوں پر ریڈیو کے قیام نے اس صنف
کی ترویج وترقی میں نمایاں رول ادا کیا۔ ریڈیو کا ڈراما اگرچہ اسٹیج ڈرامے سے تکنیک
کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے لیکن اپنی جگہ یہ بھی ایک طاقتور ذریعہ اظہار ہے
ریڈیو ڈراما اپنے صوتی اثرات سے ایسا جادو جگاتا ہے جو دوسرے اصناف میں

ناپید ہے۔ اس سلسلے میں جموں اور سرینگر سے ریڈیو اسٹیشنوں سے بے شمار
ڈرامے نشر ہوئے اور جس میں موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ تکنیک کی
جدت اور تازہ کاریوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ نمایاں لکھنے والوں میں پردیسی،
اختر محی الدین، سوم ناتھ زتشی، رام کمار ابرول، ٹھاکر پونچھی، سکھ دیو سنگھ، علی محمد لون،
ہری رائے زادہ، پشکر ناتھ، زیڈ بسیمی، وجے سمن، وجے سوری، بنسی نردوش، چندر شرما،
دینو بھائی پنت، وید راہی، شبنم قیوم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ چند برسوں سے
ریڈیو کشمیر سری نگر کے زیر اہتمام "جشنِ تمثیل" کے پروگرام کے تحت ہر سال باقاعدگی
سے ڈرامے پیش کئے جاتے ہیں اور ڈراما ئی ہفتہ کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ان میں سے
بہترین ڈراما چن لیا جاتا ہے۔ بعض اچھے ڈرامے نیشنل ہک اپ کے لئے منتخب
کئے جاتے ہیں۔ اس طرح سے مختلف فنکاروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ان میں
سے بعض ڈرامے شائع بھی ہوئے ہیں۔ اس دور کے ڈراموں میں زیڈ بسیمی کا ڈراما
'جہانگیر کی موت' دینو بھائی پنت کا 'سورگ کی کھوج' ہری رائے زادہ کا
'پرانے دیپ نئے اجالے' وجے سمن کا 'انگ مان' رام کمار ابرول کے بعض
ڈرامے مثلاً 'انسان جیت گیا' دھرتی اور رسم' 'ہنگی کے پاٹ' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔
ریاستی کلچرل اکادمی کی خدمات کو بھی اردو ڈرامے کی توسیع کے سلسلے میں نظر انداز
نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ادارہ برسہا برس سے ڈراما کے جشن مناتا رہا ہے۔ اس کے
اہتمام سے کئی ڈراما کلب وجود میں آئے ہیں۔ جن کی باضابطہ طور پر مالی امداد
فراہم ہوتی ہے جس نے نہ صرف اسٹیج سے تعلق رکھنے والے فنکاروں کو آگے
بڑھنے کے امکانات مہیا کئے ہیں بلکہ ڈراما لکھنے والوں کی صلاحیتوں کو بھی اجاگر
کیا ہے۔ کشمیر کے ڈراما نگاروں میں پردیسی کے بعد سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون،
بنسی نردوش، ہری کرشن کول، ہردے کول بھارتی، آفاق احمد، شکیل الرحمٰن،

حامدی کاشمیری، فاروق مسعودی، وغیرہ کے ڈرامے بہت مقبول ہوئے۔ ڈرامے کی صنف میں ٹیلی ویژن کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو صرف آواز کے سہارے سے ہی نہیں بلکہ اداکاری کے سہارے سے بھی آگے بڑھتا ہے۔ اس نے ہمارے بہت سے ڈراما نگار پیدا کئے۔ لون بنیادی طور پر ڈراما نگار تھے۔ ریڈیو کی ملازمت میں ان کی مخفی صلاحیتیں نکھر گئی تھیں۔ ان کے مشہور ڈرامے گھروندے نے ایک زمانہ میں دھوم مچا دی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے دیولنے کا خواب، اور چٹان جیسے لازوال ڈرامے لکھے۔

ڈراما اور تھیٹر کی تحریک میں پران کشور کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ پران کشور اپٹا (IPTA) کے زمانے سے ہی یہاں کی ڈراما تحریک کے ساتھ وابستہ رہے۔ انہوں نے ساری زندگی ریڈیو کی ملازمت میں صرف کی۔ جہاں ڈراما کی ہدایت کاری اور پروڈکشن ان کے ذمہ تھی۔ انہوں نے نہ صرف خود کئی قابل قدر ڈرامے لکھے بلکہ ریڈیو اور ریڈیو سے باہر بھی ان گنت ڈرامے مانجھ کر پیش کئے۔ اس سلسلے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

ڈراما چونکہ بنیادی طور پر دیکھنے یا سننے کی چیز ہے۔ اس لئے شائع شدہ ڈراموں کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو امتیاز علی تاج کی انارکلی کو حاصل ہو سکی۔ جو ایک خالص ادبی ڈراما ہے۔ حالانکہ ہمارے یہاں شائع شدہ ڈراموں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے ؛

# ترقی پسند تحریک

ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ چند برسوں میں ہی اس تحریک نے ملک کے تقریباً ہر حصے میں اپنے بال و پر پھیلا دیئے۔ ہر چند کہ کشمیر نہ اردو کا علاقہ تھا اور نہ اردو یہاں کے لوگوں کی مادری زبان تھی۔ اس کی عمر یہاں ستر پچھتر برس سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی یہاں کے اہل قلم نے اسے گلے لگایا اور بساط بھر اس زبان کے توسط سے اپنے جذبات کو زبان دی۔ ایسے میں کشمیر میں اردو ادب کے کسی مخصوص رجحان کی تلاش اس زمانہ میں بے سود ہے۔ لیکن اس کے باوصف جب ترقی پسند تحریک رنگ، نسل زبان اور علاقوں کے حصار توڑتی ہوئی پورے ملک میں پھیلنے لگی تو کشمیر کے اہل قلم بھی اس ہمہ گیر تحریک کے اثرات سے دامن نہ بچا سکے۔

ادھر اسی زمانہ میں سیاسی سطح پر کشمیر میں زبردست تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ مقامی طور پر مسلم کانفرنس کشمیر کی بڑی سیاسی جماعت تھی۔ اسے نیشنل کانفرنس میں بدل

دیا گیا تھا۔ اس کی قیادت شیخ محمد عبداللہ جیسے روشن دماغ کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔ اس جماعت میں غیر مسلم بھی شامل ہونے لگے تھے۔ اس نے جو سیاسی لائحہ عمل اپنا لیا تھا وہ فرقہ واریت کے بجائے قومیت کا تھا اور اس کے ڈانڈے ہندوستان کی تحریک آزادی سے مل چکے تھے۔ چنانچہ کشمیر میں بھی ڈوگرہ شاہی کے استحصال اور استبداد کے خلاف آواز بلند ہوئی تھی۔ نیشنل کانفرنس کی قیادت میں غلامی افلاس اور ناداری کے خلاف جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کی آواز باز گشت کہیں کہیں شعر و نغمہ میں بھی سنائی دینے لگی تھی۔ مہجور، آزاد اور دلسوز کے کشمیری نغموں میں بغاوت کرتی ہوئی ایک دھیمی دھیمی لے اسی زمانے کے آس پاس سنائی دیتی ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے لکھنؤ میں منعقدہ پہلے ہی اجلاس کے اعلان نامے میں علاوہ اور باتوں کے کہا گیا تھا:

"ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے
بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس،
سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔"

یہ محض اتفاق نہیں بلکہ وقت کا تقاضا تھا کہ شیخ محمد عبداللہ کی سربراہی میں جاگیردارانہ نظام کے خلاف کشمیر میں جو جد و جہد شروع ہوئی تھی۔ اس میں اور باتوں کے علاوہ بھوک، ناداری استحصال اور غلامی کے مسائل پیش پیش تھے۔

اس زمانہ میں پریم ناتھ ساہو ر دلتی نام کے ایک نوجوان قلم کار اردو کے ادبی حلقوں میں ابھر رہے تھے۔ یہ نوجوان بعد میں برصغیر کے ادبی حلقوں میں پریم ناتھ پردیسی کے نام سے اپنی پہچان منوانے میں کامیاب ہوئے۔ پردیسی کشمیر کے پہلے افسانہ نگار تھے۔ شروع شروع میں وہ ٹیگور کے تتبع میں بے حد رومانی نثر لکھتے تھے۔ ان کی کہانیوں پر کہانیوں سے زیادہ ادب لطیف کا گماں ہوتا تھا۔ لیکن پریم چند کی سماجی حقیقت نگاری اکثر

کی اشاعت، استحصالی قوتوں کی بے انصافی اور ریاکاری، ترقی پسند تحریک کے آغاز اور پھر خود یہاں کے سیاسی حالات نے پردیسیؔ کو پہلی بار احساس دلایا کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ضایع کیا ہے۔ وقت کی آہٹ سن کر انہیں اپنی فرض ناشناسی اور کم مائگی کا اندازہ ہوا۔ اس کا اعتراف خود کرتے ہیں:۔

"یہ ایسی تبدیلی تھی جس نے میرے سامنے نئی راہیں کھول دیں، بلکہ ہمارے ملک کے سامنے نیا نظریہ رکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب بھی اگر میں اس نظریہ کا ساتھ نہ دوں تو میری افسانہ نگاری بےکار ہے اور آنے والا مورخ خدا جانے مجھے کن ناموں سے یاد کرے گا۔ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے میں نیشنل کانفرنس میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر درونِ پردہ میں عوام کو اپنی کہانیوں سے غلامی، افلاس اور استحصال کا احساس دلا سکتا ہوں"۔

(افسانہ الہ آباد نمبر ۸)

پردیسیؔ نے نہ صرف اس استحصال کے خلاف لکھنا شروع کیا۔ بلکہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک ادبی انجمن تشکیل دی۔ جس کا نام حلقہ ارباب ذوق تھا۔ یہ انجمن اس صدی کے چوتھے دہے کے شروع میں منظم ہوئی۔ اس انجمن کا کوئی تعلق حلقہ ارباب ذوق لاہور کے ساتھ نہیں تھا۔ بلکہ دونوں کے مقاصد میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ کشمیر کے نوجوان ادیبوں کا یہ مختصر سا حلقہ پریم ناتھ پردیسی کے مکان تک محدود تھا۔ یہیں ادبی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ اس انجمن کے سرگرم اراکین میں پی۔ این۔ پشپ، پریم ناتھ در، قیصر قلندر، سوم ناتھ زتشی، مرزا عارف بیگ وغیرہ تھے۔ یہاں کہانیاں پڑھی جاتی تھیں، شعر سنائے جاتے تھے، بحثیں ہوتی تھیں۔ ترقی پسند تحریک کے یہ بلاواسطہ اثرات

تھے۔ جس کے باعث یہ لوگ اکٹھا ہو گئے تھے۔ لیکن یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا اور انجمن کا شیرازہ بکھر گیا۔

حلقہ ارباب ذوق کے بند ہو جانے سے ادب کے سوتے نہیں سوکھ گئے اس زمانہ میں دور حاضر کے مشہور فلم ساز اور ہدایت کار اور اس زمانہ کے ترقی پسند افسانہ نگار راما نند ساگر (جن کا وطن کشمیر ہے) پردیسی کے قریب آ گئے۔ وہ کچھ عرصہ ریاست سے باہر رہ کر اس تحریک سے راست طور پر وابستہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے پردیسی کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ کھولنے پر آمادہ کیا۔ ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ پریم ناتھ پردیسی اور راما نند ساگر نے کشمیر میں ترقی پسند تحریک کو منظم کرنے میں وہی مساعی کی جو بنے بھائی (سجاد ظہیر) اور ان کے ساتھی ہندوستان کے باقی حصوں میں کر چکے تھے۔ پردیسی نے اس کا ذکر خود بھی کیا ہے:-

> "دو سال کے بعد راما نند ساگر آ گئے۔ آتے ہی مجھ سے ملے۔ انہوں نے مجھے انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ کھولنے کے لئے کہا۔ چنانچہ ہم دونوں نے مل کر یہاں کے ترقی پسند ادیبوں کو اکٹھا کیا اور ایک انجمن قائم کی جو آج تک قائم ہے۔"

یہ ترقی پسند ادیب وہی تھے جو حلقہ ارباب ذوق کے ساتھ وابستہ رہ چکے تھے۔

اس طرح سے انجمن ترقی پسند مصنفین باضابطہ طور پر منظم ہوئی۔ انجمن کا دفتر پردیسی کا مکان تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا دائرۂ اثر پھیلتا گیا۔ بیرون کشمیر سے آنے والے ترقی پسند شعراء اور ادباء اس انجمن کی نشستوں میں شریک ہو کر نوجوان فن کاروں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ اس سے اس تحریک کے پنپنے کی فضا تعمیر ہوئی۔ اس چھوٹی سی انجمن کی کارگزاری نے ریاست جموں و کشمیر میں ایک ہمہ گیر ادبی تحریک کی شکل اختیار کر لی

ان بنیادی مسایل پر غور و فکر ہونے لگا جن کا ذکر انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے اعلان نامے میں ہوا تھا۔

ذکر ہو چکا ہے کہ اس انجمن کے جلسے ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو پردیسی کے مکان پر ہوا کرتے تھے۔ مگر جب اس کا حلقہ اثر وسیع تر ہوتا گیا اور ادب نواز لوگ دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔ تب بسکو سکول اور ایس پی کالج کے ہال میں جلسے ہونے لگے۔ ان جلسوں کی کاروائی نندلال واتل کی ادارت میں شایع ہونے والے اخبار "نویگ" اور بعد میں ہفت روزہ "نظام" بمبئی میں شائع ہونے لگیں۔ اس دوران راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، بلراج ساہنی، دیویندر ستیارتھی اور کئی ترقی پسند ادیب اور شاعر یہاں آئے اور انجمن کی سرگرمیوں میں شریک ہوتے رہے۔ مقامی ادیبوں اور شاعروں میں پریم ناتھ پردیسی، سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، صلاح الدین احمد، کنول نین پرواز، پروفیسر محمود ہاشمی، ایس، این، کول، قیصر قلندر، مہندر رینہ، حمید فطرت، ڈاکٹر نندرالاسلام قابل ذکر ہیں جو اس انجمن کے ساتھ وابستہ تھے۔ یہ انجمن ۱۹۴۸ء تک سرگرم عمل رہی اور فعال ثابت ہوئی۔ رامانند ساگر نے اپنی کئی کہانیاں اس دوران لکھیں اور ان نشستوں میں بحث کے لئے پیش کیں۔ پردیسی نے بھی اپنی کئی مشہور کہانیاں جن میں ڈوگرہ شاہی کے استحصال کو موضوع بنایا گیا تھا اس دور میں لکھیں۔ انجمن کی مختلف نشستوں میں پڑھی جانے والی کہانیوں میں "گبتے"، "کاغذ کی جھنڈیاں"، "جواری" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں انگریزی سامراج کی شہ پر پاکستان نے قبایلی دراندازوں کو ہتھیاروں سے لیس کشمیر بھیج دیا۔ یہ وہ دن تھے جب ڈوگرہ شاہی آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی کمزور افواج جدید ہتھیاروں سے لیس اور گوریلا طرز کی جنگ میں ماہر حملہ آوروں کے سامنے پسپا ہو گئیں۔ مہاراجہ رعایا کو بے دست و پا چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا اور عنان حکومت عوام کے ہاتھ میں آگئی جن کے رہنما شیر کشمیر

شیخ محمد عبداللہ تھے۔ ہندوستانی افواج کی مدد سے دراندازوں کو واپس بھگا دیا گیا۔ یہ ہماری تواریخ کا انتہائی نازک موڑ تھا۔ دراندازوں نے سرینگر شہر کی حدود تک آکر لوگوں کا امن و سکون لوٹ لیا تھا۔ لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر خارجی دفاع کے ساتھ اندرونی امن و امان اور اعتماد کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ایک چھوٹی سی فوج نیشنل ملیشیا کے نام سے منظم ہوئی جس کی ایک ونگ دانش وروں، ادیبوں، شاعروں اور باشعور نوجوانوں پر مشتمل تھی اس کا نام نیشنل کلچرل فرنٹ رکھا گیا۔ یہاں اس بات کا اعادہ کرنا ضروری ہے کہ نیشنل کانفرنس کی قیادت میں بیشتر لوگ ترقی پسند خیالات رکھنے والے نوجوان تھے۔ خود نیشنل کانفرنس کے پروگرام "نیا کشمیر" کا مسودہ اس بات کا بین ثبوت ہے۔ بہر حال کلچرل فرنٹ کو منظم کرنے کی تحریک خواجہ غلام محمد صادق اور مولانا محمد سعید نے دی جو نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ محاذ کا ابتدائی دفتر کارونیشن ہوٹل (موجودہ کشمیر گیسٹ ہوس) تھا۔ یہیں اس ہوٹل کے کمروں میں عوام کا لہو گرمانے والے نغمے شروع شروع میں تخلیق ہوئے۔ اس محاذ سے تعلق رکھنے والے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں میں بندوق تقسیم کئے گئے، ان کو تربیت دی گئی۔ یہ لوگ بندوق کاندھوں پر تھامے راتوں کو پہرہ دیتے رہے اور دن میں نغمے تخلیق کرتے رہے۔ پردیسی نے سب سے پہلے اس محاذ کے لئے اپنی خدمات وقف کردیں۔ اس دور میں ان کا مشہور نغمہ ؎

قدم قدم بڑھیں گے ہم
محاذ پر لڑیں گے ہم

زبان زد عام تھا۔ پردیسی کے دو ڈرامے "سوالی" اور "مجاہد شیروانی" اسی دور کی تخلیق ہیں۔ جو قومی کلچرل فرنٹ کے اسٹیج پر پیش کئے گئے اور مقبول ہوئے۔

کلچرل فرنٹ کو تھوڑے ہی عرصے میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے شعبہ

تھیٹر (جو ایک طرح سے "اپٹا" کے نقش قدم پر چل رہا تھا) نے پردیسی کے علاوہ محمود ہاشمی کا ڈراما "کشمیر یہ ہے" اور خواجہ احمد عباس کا ڈراما "چودہ گولیاں" اسٹیج کیا۔ تھیٹر کے اس شعبے میں دینا ناتھ نادم، موہن لال ایمہ، اوشا کشیپ، خورشید جلال الدین، سمترا لکھوارا سنتوش لکھوارا، اچلا سپرو، شیلا بھاٹیہ، بیتر جنگ، راج ہنس کھنہ، درگا سنگھ، گردھاری ودر پران کشور وغیرہ شامل تھے۔

یہ ڈرامے ہمارے اسٹیج اور تھیٹر کی تحریک کے لئے فعال ثابت ہوئے۔

ہنگامی سیاسی صورت حال کے اعتدال پر آنے کے بعد اس فرنٹ کو توڑ دیا گیا۔ اس کے کینڈے پر ریاستی کلچرل کانگریس تعمیر ہوئی۔ اس کے تین شعبے تھے، ادیبوں اور شاعروں (رائیٹرس) کا شعبہ تھیٹر آرٹسٹوں کا شعبہ اور مصوروں کا شعبہ۔ رائٹرس شعبے کو P.W.A (پروگریسو رائیٹرس ایسوسی ایشن) کہا جاتا تھا۔ اس کی سربراہی اور سرپرستی خواجہ غلام محمد صادق کرتے تھے۔ یہ انجمن اب مکمل طور پر ترقی پسند تحریک کا ایک حصہ تھی۔ بلکہ انجمن کی ایک فعال شاخ کی طرح سرگرم عمل تھی۔ اس کے ڈسپلن کی پابند تھی اور اس کے پروگرام کو اپنے طور سے آگے بڑھا رہی تھی۔ دانشوروں کی ایک بڑی تعداد اس جماعت کے ساتھ وابستہ تھی۔ ان میں پیر عبد الاحد، غلام رسول رینزو، پیر غیاث الدین نور محمد، موتی لال مصری، پران ناتھ جلالی، بدری ناتھ نشاط، مدھو سودھن کوثر، چند اہم نام ہیں۔ بزرگ ادیبوں اور شاعروں میں شاعر کشمیر مہجور، عاصی، ماسٹر زندہ کول اور نئی نسل کے تقریباً تمام نمائندہ ادیب اور شاعر اور فن کار اس انجمن کے ساتھ وابستہ تھے۔ دینا ناتھ نادم، رحمان راہی، امین کامل، مہندر رینہ، نور محمد روشن، عزیز ہارون، حبیب کامران، ارجن دیو مجبور، اختر محی الدین، سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، قیصر قلندر، بنسی نردوش، نند لال امبار دار، پریم ناتھ پردیسی، دینا ناتھ المست، دیپک کول، نسیم بہادر بھان، چند اہم نام ہیں۔ اس انجمن کی ہفت روزہ نشستوں میں بڑی گہما گہمی ہوتی تھی۔

نہ صرف ادیب اور شاعر بلکہ دانشور اور علم دوست جمع ہو جاتے تھے۔ زوردار بحثیں ہوتی تھیں، یہ صحیح ہے کہ تنقید اور تخلیق کا رخ انتہا پسندانہ تھا اور وہی صورت حال تھی جو ترقی پسند تحریک کے شروع کے دور میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ان جلسوں کے ذریعے کشمیری اور ڈوگری ادب کا احیائے نو ہوا۔ محسوس یہ کیا گیا کہ ان انقلابی خیالات اور بدلتے ہوئے شعور کی ترجمانی بہتر طور پر مقامی اور مادری زبان میں ہو سکتی ہے چنانچہ کشمیری، ڈوگری اور لداخی زبان میں ادب تخلیق کیا جانے لگا۔ جس سے ان زبانوں میں وقیع ادب پیدا ہوا۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ آج کے کشمیری زبان کے سربرآوردہ ادیب اور شاعر ہیں۔ جو اس انجمن سے وابستہ تھے وہ اردو میں لکھتے تھے۔ نادم، راہی، کامل، اختر، نردوش، دیپک، تیج، سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون ان سب کی جولاں گاہ اردو زبان تھی۔ اس دوران اس انجمن کے روح رواں ہندی کے مشہور ترقی پسند ادیب، ناول نگار اور نقاد شودھان سنگھ چوہان تھے۔ جو غالباً مرکزی انجمن کی ہدایات کے مطابق یہاں کل وقتی طور پر موجود تھے۔ ان کی سربراہی میں انجمن کی سرگرمیاں فعال رہیں۔ تھیٹر ونگ سے کے ساتھ مشہور فن کارہ شیلا بھاٹیہ وابستہ تھیں۔ انجمن کے جلسوں میں علی سردار جعفری، ڈاکٹر رام بلاس شرما، ڈاکٹر سلامت اللہ، ضیا احمد، کمال احمد صدیقی (جو بعد میں برسوں یہاں ریڈیو سے وابستہ رہے) اور دوسرے لوگ برابر حصہ لیتے رہے جب ان کا قیام یہاں ہوتا تھا اس طرح سے ایک مقررہ لائحہ عمل کے مطابق نہ صرف تحریک چلائی گئی بلکہ ادب تخلیق ہونے لگا۔

۱۹۵۳ء میں کشمیر میں پھر ایک سیاسی تبدیلی آئی۔ شیخ محمد عبداللہ گرفتار ہوئے۔ بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق کی قیادت میں نئی حکومت نے کئی اقدامات کیے۔ آل سٹیٹ کلچرل کانگریس کا نام سٹیٹ کلچرل کانفرنس رکھا گیا۔ اب اس میں لداخ اور جموں کے ادیب اور شاعر زیادہ شد و مد سے شامل تھے۔ اس تحریک

نے عوامی بنیاد حاصل کرنے کے لئے علاقائی زبانوں میں لکھنے پر زور دیا۔ ایک طرح یہ محسوس کیا گیا کہ مادری زبان میں بہتر طور پر اظہار خیال ہو سکتا ہے لیکن دوسری اہم بات یہ تھی کہ عوام کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے ان کے ساتھ ان کی ہی زبان میں بات کہی جائے تاکہ ان کے مسائل کو بہتر طور پر پیش کیا جا سکے۔ چنانچہ کشمیری، ڈوگری اور لداخی زبانوں کے ذریعہ شعر و ادب کا بہتر سرمایہ پیدا ہوا۔ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر اس تحریک کا آغاز نہ ہوا ہوتا تو غالباً ہماری علاقائی زبانوں کا احیائے نو اس قدر سرعت سے نہ ہوتا۔

انجمن کی تھیٹر ونگ جس کا تعلق غالباً اپٹا کے ساتھ تھا خوب سے خوب تر کام کرنے لگی۔ کشمیری شعر و نغمہ کو جس میں اب انقلاب کا جز پیدا ہونے لگا تھا عوام تک پہنچانے کے لئے سب سے بہتر کارنامہ عبدالغنی نمتہ ہالی نام کے ایک نوجوان اور ان کے ساتھیوں نے کیا۔ نمتہ ہالی کے پاس لحن داودی تھا۔ انہیں عوامی موسیقار اور مقامی پال رابسن کہا جاتا تھا۔ وہ جب ساز چھیڑتے اور اپنی آواز اس سُر کے ساتھ ملاتے تو فضا ایک انقلابی آہنگ سے نکھر اٹھتی۔ راقم السطور نے اس زمانے میں خود دیہاتوں میں سینکڑوں ہزاروں کے ٹھٹھ دیکھے ہیں جو ان نغموں کی شعلہ نوائی سے گونج اٹھتے اس زمانے کے مشاعرے بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ دیہاتوں میں ڈرامے اسٹیج ہوتے۔ کلچر، شاعری، ادب اور فن کے توسط سے عوام میں تحرک پیدا کرنے کی یہ شعوری کوشش ایک تاریخی حقیقت ہے۔

اس دوران انجمن کی طرف سے کئی کتابچے شایع ہوئے۔ ان میں "گائے جا کشیر" وزہ مل (بجلی) سون گیون (ہمارے نغمے) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دینا ناتھ نادم اس تحریک میں قافلہ سالار کی حیثیت رکھتے تھے۔ سحر مشرقی کے قلمی نام سے لکھنے والا یہ نوجوان جب مکمل طور پر اردو سے کشمیری کی طرف

آگیا تو نادم کے تخلص سے شعلہ نوائی کرنے لگا۔ وہ اس زمانے میں نئے کشمیری شاعروں میں سب سے بلند قامت تھے۔ حق بات یہ ہے کہ نادم نے کشمیری شاعری کو ایک نئی سمت عطا کی۔ اس زبان میں ہئیت اور مواد کے اعتبار سے ان کے تجربے ہمیشہ وقعت کی نظروں سے دیکھے جائیں گے۔ وہ کشمیری میں آزاد نظم اور نظم معری کے موجد ہیں۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ جس میں ان کے انقلابی اور باغیانہ موضوعات ملتے ہیں آزاد نظم کے فارم میں ہیں۔ انہوں نے کشمیری زبان میں پہلا سانیٹ لکھا، پہلا اوپیرا تخلیق کیا۔ پہلا افسانہ لکھا۔ وہ برابر ایک رہنما کی حیثیت رکھتے تھے۔ نادم نے لوک گیت کے فارم سے خوب کام لیا اور اسے اپنی شاعری میں برتا۔ چکبست، احسان، دانش، اور جوش کی شاعری نے ایک زمانہ میں انہیں متاثر کیا تھا۔ لیکن ترقی پسند تحریک کے ساتھ وابستہ ہونے کے بعد وہ نئے موضوعات پر لکھنے لگے اور کشمیری ادبیات کے لیے نئے دریچے کھول دیے ہیں۔

اس زمانہ میں سوم ناتھ زتشی جو برسوں انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیکرٹری رہے اردو سے کشمیری کی طرف منتقل ہوئے۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے۔ انہوں نے لگ بھگ اسی زمانہ میں نادم کے جوابی کارڈ (پہلا افسانہ) کے ساتھ ساتھ یلہ پھول گاش (جب صبح ہوئی) لکھا۔ اس طرح اس افسانے کو بھی نادم کے افسانے کے ساتھ ساتھ کشمیری میں اولیت حاصل ہے۔ اختر محی الدین کا تعلق بھی اسی دور میں اس انجمن کے ساتھ رہا۔ اختر اردو کے جانے مانے افسانہ نگار تھے بلکہ ان کا افسانہ "پونڈریج" اردو افسانوں کے ایک مقابلے میں انعام یافتہ تھا۔ وہ بھی کشمیری میں کہانیاں لکھنے لگے۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ ست سنگر (سات چوٹیاں) کشمیری زبان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اسے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

راہی، کامل، فراق، روشن، رنجور با صلاحیت شاعر تھے۔ جنہوں نے موضوعات

کی رنگارنگی اور ہیئت کے کئی تجربوں سے کشمیری ادب میں اپنا مقام بنایا۔
انجمن کی طرف سے ایک رسالہ "کونگ پوش" (کیسر کا پھول) شایع ہونے لگا۔ شروع میں اس میں اردو اور کشمیری کے دو سیکشن ہوا کرتے تھے۔ بعد میں کلچرل کانفرنس کے زمانے میں اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں کونگ پوش علیحدہ علیحدہ شایع ہونے لگا۔ ترقی پسند خیالات اور نظریات پر استوار ایک اور رسالہ "آزاد" تھا۔ جو بدری ناتھ نشاط اور مدھو سودھن کوثر کی ادارت میں شایع ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ رسالے بند ہو گئے لیکن ترقی پسند نظریات کی ترویج میں ان رسالوں کی دین کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اس دوران کئی چھوٹی بڑی تنظیمیں وجود میں آئیں۔ حلقہ علم وادب خانیار خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اگرچہ تنظیمی طور پر یہ انجمنیں، ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے ساتھ وابستہ نہیں تھیں۔ لیکن یہاں جس طرح کا ادب پیش کیا جاتا تھا اور جس طرح کے بحث مباحثے ہوتے تھے۔ ان کا مقصد ترقی پسند خیالات کی توسیع اور ترویج تھی۔
اب قومی اور بین الاقوامی مسایل نے بھی ادب میں راہ پانا شروع کی تھی۔
اس دوران خود کلچرل کانفرنس اور دوسری انجمنوں میں جو نوجوان فن کار ابھرے ان میں خاص طور پر امیش کول، غلام نبی خیال، چمن لال چمن، مکھن لال بکیس، مظفر عازم، فاروق بڈگامی، شاہد بڈگامی، موتی لال ساقی، برج پریمی، پشکر ناتھ، حکیم منظور، محمود بدخشی، اوتار کرشن رہبر، طاہر مضطر، شنکر رینہ، تاج بیگم، نرملا کسم، غلام نبی بابا، رشید نازکی، ایوب بے تاب، بہاؤالدین زاہد، بدرالدین، شمیم احمد شمیم، ہری کرشن کول، فاروق نازکی اور بیسوں دوسرے فنکار قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض حضرات آج اردو اور کشمیری کے سربرآوردہ ادیب اور شاعر ہیں اور قومی شہرت کے مالک ہیں۔
انجمن ترقی پسند مصنفین (۔۔۔) کے پہلے اعلان نامہ میں کہا گیا تھا:۔

ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنون
لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے
نجات دلائے اور ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جدوجہد
کا ترجمان بنا کر روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس کیلئے
انسانیت اس دور میں کوشاں ہے۔
ہم ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین قدروں کے وارث
ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس لئے زندگی کے جس شعبے
میں ردعمل کے آثار پائیں گے انہیں افشا کریں گے۔
ہم انجمن کے ذریعہ سے ہر ایسے جذبے کی ترجمانی کریں
گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ
دکھائے۔"

اور آل سٹیٹ کلچرل کانفرنس نے بھی اپنے اعلان نامے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی
پہلی کانفرنس کے منشور کو کچھ تبدیلی سے دہرایا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا:۔
"ہم اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی تہذیب
اپنے وطن اپنے عوام کی زندگی عزیز ہے۔ ہم اس بات
کا اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے اجداد نے زندگی کی جو
تہذیبی میراث ہمارے لئے چھوڑی ہے، ہم ہر
قیمت پر اس کا تحفظ کریں گے اور ان کی شاندار
روایات کی ترقی دے کر ایک بہتر زندگی کی تشکیل
کریں گے۔ ہم اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ زندگی
کی طرح فن اور ادب لامحدود وسعتوں کا حامل ہے

ان پر کسی ایک گروہ، طبقہ یا فرقہ کا اجارہ نہیں ہو سکتا
ہم یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ فن اور ادب کی ترقی کیلئے
عوام کی زندگی کا بہتر ہونا ضروری ہے۔ فن اور ادب
ہمیشہ سے عوام کے دل کی دھڑکنوں کی ترجمانی کرتے
رہے ہیں۔ ہمیشہ اسی فن نے مقبولیت حاصل کی ہے
جو عوامی زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہا ہو.....
ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہم اپنے فن کے ذریعہ
سے انسان دوستی اور امن پسندی کی ان روایات کو
اور زیادہ نمایاں کریں گے۔ جن کو ہر دور میں ہمارے
اجداد نے اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔"

(دوماہی کونگ پوش اردو نمبر ۱)

دونوں اعلان ناموں میں مماثلت ہے اور دونوں ایک ہی سمت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ۵۸-۱۹۵۷ء کے بعد یہ تحریک آہستہ آہستہ دھیمی پڑنے لگی اور اس میں وہ دم خم نہ رہا۔ یہ صورت حال پورے ہندوستان میں ترقی پسند تحریک میں پیدا ہو گئی۔

کشمیر میں ترقی پسند تحریک ایک اہم ادبی تحریک رہی ہے۔ اس تحریک نے کشمیر میں ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت صورت اختیار کر لی تھی اور کشمیری ادبیات ہی نہیں بلکہ ڈوگری اور لداخی ادب کی نئی سمتیں اس تحریک نے متعین کیں۔ اس لئے کشمیر میں ادب کا کوئی سنجیدہ قاری اس تحریک کے تاریخی اور افادی رول کو صرف نظر نہیں کر سکتا۔

******

# ریاستی کلچرل اکادمی کی ادبی خدمات

اس بیان سے خود ستائی کا کوئی پہلو ظاہر کرنا مقصود نہیں بلکہ ایک حقیقت کا اظہار کرنا ہے کہ اس خطۂ ارضی نے صدیوں سے اپنے کارناموں کے جوہر سے ساری دُنیا کو قائل کیا ہے اور یہاں کے ذہن رسا کا لوہا منوایا ہے۔ یہ کارنامے ایسے ہیں جن کے باعث یہاں کی کتھائیوں میں کئی رنگوں کا اضافہ ہوا ہے۔ علم، ادب، فنون لطیفہ، فلسفہ، گیان و عرفان کونسا شعبہ ہے، جہاں ہم نے اپنا چراغ روشن نہ کیا ہو۔ سنسکرت اور فارسی ادبیات کے بعد جس زبان نے ہم کو اپنا گرویدہ بنالیا وہ اُردو زبان ہے۔ اُردو نے اگرچہ ہماری ریاست سے بہت دور جنم پایا لیکن یہاں کے لوگوں نے اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری کی اور اپنے تخلیقی ذہن کی تمام توانائیوں کے ساتھ اس زبان اور اس کے ادب کی توسیع میں اہم رول ادا کیا اور اس بات کے باوصف کہ ہم کو اہل زبان ہونے کا دعویٰ نہیں ہم نے اس زبان کو اپنی مادری زبان سے کم اہمیت نہیں دی۔ یہی وہ زبان ہے جس کو ہم نے برسا برس تک ذریعۂ اظہار بنایا جس میں ہم نے پہلا اخبار نکالا۔ پہلا افسانہ تخلیق کیا، پہلی تنقید لکھی اور تحریک آزادی کے پہلے نغمے الاپے۔ یہ زبان سال ہا سال تک درباری زبان رہی ہے۔ اور آج بھی اسے سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ آج بھی ہم اپنی تمام محبتوں کے ساتھ اسے گلے لگائے ہوئے

ہیں۔ اگرچہ اس زبان میں تعداد کے اعتبار سے ہمارے کارنامے بہت قلیل ہیں۔ لیکن اردو ادب کا کوئی سنجیدہ قاری ان کارناموں کی اہمیت کو صرف نظر نہیں کر سکتا اور ہمارا دعویٰ بے بنیاد نہیں کہ اردو کی کوئی بھی ادبی تواریخ ہمارے کارناموں کا ذکر کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان و ادب کے خدوخال ڈوگرہ عہد میں ابھرنے لگے۔ حتیٰ کہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد حکومت کے دوران ۱۸۸۹ء میں اسے سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ یہ ریاست میں اس زبان کی مقبولیت تھی کہ جس نے آہستہ آہستہ فارسی کی جگہ لی اور اس ریاست کے باصلاحیت لوگوں نے اس زبان کے توسط سے یہاں کی معاشی سماجی اور ادبی زندگی میں اپنا رول ادا کرنا شروع کیا۔

ڈوگرہ شاہی کے طوق غلامی کو اتار پھینکنے کے بعد جب ریاست کے باشندوں نے آزاد فضاؤں میں سانس لینا شروع کیا۔ تو دوسری زبانوں کے علاوہ جس بات کی طرف ہماری خصوصی توجہ ہوئی وہ گنگ و جمن کی فضاؤں سے معطر زبان تھی ہم نے اپنی علاقائی زبانوں میں یعنی کشمیری، ڈوگری اور لداخی کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس زبان کی وسعت، پھیلاؤ اور ترقی کی راہیں نکالی ہیں کہ یہی زبان ہماری ریاست میں رابطے کی زبان ہے اور اس کی بدولت یہاں کے لوگ ریاست کی کلچرل اکائیوں کے ثقافتی رشتوں کو فروغ دے سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انفرادی کوشش کے علاوہ مختلف سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی کوششیں مستحسن ہیں۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کے بعد کلچرل فرنٹ، آل سٹیٹ کلچرل کانفرنس، لٹریری فورم، انجمن ارباب ذوق، حلقۂ علم و ادب، انجمن ترقی پسند مصنفین، بزم اردو ادب، بزم ادب کشتواڑ، انجمن ترقی اردو، انجمن فروغ اردو

جموں خاص طور پر قابل ذکر ہیں دوسرے اداروں میں ریاستی کلچرل اکادمی، ریڈیو کشمیر سری نگر و جموں، دوردرشن کیندر سری نگر، اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر اور جموں یونیورسٹی کے اردو شعبے قابل ذکر ہیں ۔ یہ سب ادارے ۱۹۴۷ء کے بعد قائم ہوئے اور جب سے اب تک بیشتر ادارے اردو ادب اور زبان کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں ۔ ان اداروں میں سے ریاستی کلچرل اکادمی کی ادبی خدمات خصوصی طور پر اہم ہیں۔ اس ادارے نے اردو ادب کی ترویج اور توسیع میں نمایاں رول ادا کیا ہے ۔

ریاستی کلچرل اکادمی کا افتتاح ۱۴ جولائی ۱۹۵۸ء کو صدر ریاست نے بحیثیت سربراہ اکادمی انجام دیا۔ اسطرح سے اکادمی اپنی پچیس سالہ شاندار خدمات انجام دینے کے بعد آج اپنا جشن سیمین منا رہی ہے اور یہ جلسہ ہر حال میں اس کے شایان شان ہے ۔ کلچرل اکادمی کی کارکردگیوں کا دائرہ وسیع ہے ۔ اس کے فرائض میں نہ صرف ریاست میں مروج مختلف زبانوں کی ترویج اور توسیع ہے ۔ بلکہ سنگیت، مصوری اور فنون لطیفہ کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ یہاں کی ثقافت کی توسیع کا کام بھی ہے ۔ لہذا اس ادارے سے یہ توقع کرنا کہ یہ اپنا دائرہ عمل محض اردو کی توسیع اور ترقی تک محدود رکھے گی صحیح ہیں ہے ۔ لیکن اس کے باوصف اس ادارے نے اردو کو فروغ دینے کے لیے جو کام کیا ہے وہ قابل ستائش ہے اور جسے نظر انداز کرنا کور ذوقی اور کم ظرفی ہے ۔ اکادمی نے گذشتہ برسوں میں نہ صرف از خود کافی کتابیں شائع کروائیں بلکہ ایسے مسودات بھی چھپ کر منظر عام پر آئے ہیں، جو مالی دشواریوں کے باعث مصنفین کی عدم توجہ کے شکار ہو چکے تھے ۔ اکادمی نے مالی امداد فراہم کر کے یہ دشواریاں

کسی حد تک دور کر دیں اور بہت سے گراں قدر کارنامے سامنے آئے۔ اسی طرح دوسری کئی زبانوں کی تخلیقات کو اردو میں اور اردو تخلیقات کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کے اردو کے لیے کام کر رہی ہے اور اسطرح پورے ملک کے اردو سے دلچسپی لینے والوں کا حلقہ بڑھ گیا ہے۔ اکادمی اپنے ماہوار اور سالانہ جرائد کے ذریعے اردو کے لیے کام کر رہی ہے اور اسی طرح پورے ملک کے اردو سے دلچسپی لینے والوں تک ہماری تخلیقات پہنچتی ہیں اور ملک کے ادیبوں، شاعروں اور دوسرے لکھنے والوں کی تحریروں سے فیض حاصل کرتے ہیں۔ اس پورے کام کا جائزہ لینا یہاں دشوار ہے۔ پھر بھی چند اہم کارناموں کی طرف توجہ دلانا مناسب ہے۔ اس سلسلے میں راقم کو اکادمی کی مطبوعات اور اکادمی کے دفتر سے جو اعداد و شمار فراہم ہوئے۔ ان کی بنیاد پر اردو کے سلسلے میں اکادمی کی کارگزاری اس مختصر سے مضمون میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

## ۱۔ مالی امداد

(۱) گذشتہ پانچ برسوں کے دوران اردو کے ایک سو بائیس (۱۲۲) مصنفین کو مالی امداد کے طور پر 22,7٫09/- روپے کی خطیر رقم دی گئی ہے تاکہ وہ اپنی کتابیں شایع کر سکیں۔ اسطرح سے گذشتہ پانچ برسوں کے دوران ۱۲۲ نئی اردو کی کتابوں کا اضافہ ہوا ہے۔ کتابیں اردو ادب کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ ایسی کتابیں جو برسا برس سے گرد کی دبیز تہوں کے نیچے پڑی ہوئی تلف ہو رہی تھیں، وہ محفوظ ہو گئیں اور لکھنے والوں کے حوصلے بلند ہوئے ہیں

(ب) مزید ۲۲ مصنفین کیلئے -/22050 روپے کی رقم منظور ہوئی ہے تاکہ وہ اپنی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کرسکیں۔ ان مصنفین کی کتابیں اب شائع ہونے جارہی ہیں

(ج) گزشتہ برسوں میں اکادمی نے -/1,30,000 روپے مختلف کتابوں کی اشاعت کے لیے منظور کرلیئے ہیں۔ اس رقم سے اکادمی ہی کے اہتمام سے اردو کی اہم کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور ۱۲ جلدوں پر مشتمل اردو کشمیری فرہنگ مکمل ہوکر شائع ہوچکی ہے

(د) اکادمی ایسے مصنفین کی مالی امداد کرنے کے پروگرام پر عمل درآمد کرنے لگی ہے۔ جو روزگار کے معیاری وسائل کی عدم موجودگی کے باعث آئے دن مشکلات کا سامنا کررہے ہیں۔ اس فہرست میں اردو کے پانچ مصنفین بھی شامل ہیں جن کو اکادمی -/475 روپے ماہوار کا وظیفہ دیتی ہے۔ اکادمی نے یقیناً ایک حوصلہ افزا کام کی شروعات کی ہیں جس کے لیے یہ مبارکبادی کی مستحق ہے۔

## ۲۔ اردو میں مطبوعات

(الف) شیرازہ اور ہمارا ادب کی اشاعت:۔

اردو شیرازہ اکادمی کا ترجمان ہے اور گذشتہ بیس بائیس برس سے شائع ہورہا ہے۔ یہ رسالہ ابتدا میں سہ ماہی پرچے کے طور پر جاری کیا گیا تھا۔ ستمبر ۱۹۷۹ء سے ماہانہ ہوگیا ہے۔ اس رسالے میں ریاستی اور غیر ریاستی اردو ادیبوں کے اعلے معیار کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔ اس پرچے کیلئے بیس ہزار کی سالانہ گرانٹ مقرر ہے۔ اب تک اس رسالے کے ۲۶ شمارے چھپ چکے ہیں۔ جن میں خدیجہ گراں

قدر خاص نمبر بھی شامل ہیں۔ اس پرچے کے شایع ہونے سے مقامی
ادیبوں اور فنکاروں کی کافی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ اس رسالے
میں اس کے علاوہ اردو دنیا کے بیشتر معروف اور معتبر ادیبوں شاعروں
اور ادب کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہلِ قلم کے مضامین اور
تخلیقات شامل ہوتی ہیں۔ شیرازہ آج ملک کے معدودے چند اہم ادبی
رسائل میں شامل ہوتا ہے۔ اور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے
اکادمی کے امداد و شمار کے مطابق ملک بھر میں اس پرچے کو ۵۰۰ اعزازی
خریداروں کو مفت بھیجا جاتا ہے۔
عام شماروں کے علاوہ شیرازہ (اردو) کے کئی خاص نمبر شایع ہوئے
ہیں ان میں پریم چند نمبر، اقبال نمبر، افسانہ نمبر، حسن نمبر، ذوق نمبر،
صادق نمبر، اردو کانفرنس نمبر، للہ دید نمبر، ثقافت نمبر، زور نمبر،
سر کشمیر نمبر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان خاص نمبروں میں موضوع کے
اعتبار سے متنوع مواد اکٹھا کیا گیا ہے۔ اور بعض مضامین ایسے مسائل
اور مباحث اُبھارتے ہیں جن پر بہت کم غور و فکر ہوا ہے اور ان کے ذریعہ
سے اردو اور کشمیری شعر و ادب اور تاریخ و ثقافت کے کتنے ہی نئے پہلو
سامنے آ گئے ہیں۔
(ب) اکادمی ہر سال ایک انتھولاجی ہمارا ادب (اردو) شایع کرتی ہے
جس میں سال بھر کی منتخب چیزیں شایع ہوتی ہیں۔ گذشتہ چند برسوں
سے ہمارا ادب کے کئی جموں و کشمیر نمبر شایع ہوئے ہیں جن کی کشمیریات
کے سلسلے میں دستاویزی اہمیت ہے۔
(ج) اکادمی کا تنثر اور ڈوگری شیرازہ میں اردو سے متعلق مضامین شایع
ہوتے ہیں یا بعض اردو تخلیقات کا ترجمہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں

پریم چند، اقبال، غالب وغیرہ کے بارے میں بعض معیاری مضامین اُردو ترجمے شائع ہو چکے ہیں ان کی مدد سے کشمیری اور ڈوگری کے قارئین کو بھی اُردو ادبیات سے جانکاری ہوتی ہے۔

## ۳۔ مطبوعات

گذشتہ برسوں میں اکادمی نے اپنے صرفے سے کئی بلند پایہ اور معیاری کتابیں شائع کر لی ہیں۔ یہ ایسی کتابیں ہیں جو اکادمی خود شائع کرواتی ہے۔ ان میں اُردو کشمیری فرہنگ بہت اہم ہے۔ ۱۲ جلدوں پر مشتمل یہ فرہنگ تقریباً ۷۰ ہزار الفاظ کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس میں الفاظ کے معنی، تلفظ، ان کی اصل اور ماخذات شامل ہیں۔ اس لغت کو فرہنگ آصفیہ، فیروز اللغات، نور اللغات، مہذب اللغات اور پلیٹس (PLATTS) کی اُردو، انگریزی لغت کی بنیاد پر تیار کر لیا گیا ہے۔ یہ ضخیم فرہنگ ایک کارنامے سے کم نہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر گیان چند کی تفسیر غالب غالب کے غیر متداول کلام کی تفسیر پیش کرتی ہے اور نکات و واقعات غالب، اکبر علی خان عرشی زادہ نے اپنے حواشی اور مقدمے کے ساتھ ترتیب دی ہے جس میں غالب کے نادر واقعات اور تحریروں کو شامل کیا گیا ہے۔ دوسری اہم کتابوں میں پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کی تین جلدوں میں، کشمیر میں اردو، ڈوگری لوک گیت اور پہاڑی آرٹ (ترجمہ ٹھاکر لوکچھی)، الوار البوالکلام (مرتبہ علی جواد زیدی)، کشمیری زبان اور شاعری (عبدالاحد آزاد)، کلیات آزاد (مرتبہ ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو)، محفل اقبال (مرتبہ رشید نازکی)، انتخاب اُردو ادب (مرتبہ نور شاہ)، خیابان خیابان (مرتبہ روشن الہ سینی)، وطن کی پکار

(مرتبہ محمد یوسف ٹینگ)، دیوان میر (مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری شامل ہیں۔

## (ب) ترجمے

گذشتہ برسوں میں اکادمی کے اہتمام سے اُردو کی مقتدر شخصیات کے کارناموں کو کشمیری اور ڈوگری میں منتقل کیا گیا ہے۔ پریم چند کی بعض کہانیاں، اقبال کا منظوم ترجمہ، پرتوِ اقبال، غالب نمبر (کاشر شیرازہ)، اقبال نمبر (کاشر شیرازہ) پریم چند نمبر (کاشر شیرازہ)، غالب نمبر (ڈوگری شیرازہ) اس ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اسطرح کشمیری اور ڈوگری ادبیات کو بھی اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ مثلاً لل دید اور شیخ العالم کے کلام کو پہلی بار اُردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ نند لال کول طالب اور پروفیسر جیا لال کول کے لل دید کے کلام کا اُردو منظوم ترجمہ ایک مستحسن کام ہے۔ اسی طرح جدید ڈوگری ادب کا ارتقا (ترجمہ ٹھاکر پونچھی) پربت اور نیگھٹ (کشمیری اور ڈوگری ادبیات کے کئی رنگوں سے متعارف کراتے ہیں۔

## ۴:۔ ادبی تنظیموں کو مالی امداد

اکادمی ہر سال مختلف ادبی انجمنوں کو مالی امداد سے نواز کر ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ان میں اُردو کی ادبی انجمنیں بھی شامل ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ یہ انجمنیں باقاعدہ طور پر اُردو کی ترویج اور ترقی میں سرگرم عمل ہیں۔

## ۵:۔ ابھرتے ہوئے فنکاروں کی حوصلہ افزائی

اُردو و ادب سے دلچسپی رکھنے والے نوجوان فنکاروں کی حوصلہ افزائی کے

لیئے ہر سال نوجوان فنکاروں کی ادبی نشستیں منعقد ہوتی ہیں۔ یہاں نوجوان فنکار افسانے، مقالات اور دوسری تخلیقات پڑھتے ہیں جن پر تعمیری تنقید ہوتی ہے۔ اس طرح اکٹھا کئے ہوئے مواد سے ہر سال اُردو شیرازہ کا نوجوان نمبر مرتب ہوتا ہے۔ یہ نشستیں اُن نشستوں سے مختلف ہوتی ہیں جو دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے اشتراک سے بزم مقالات، بزم شعر، محفل افسانہ یا محفل موسیقی کے طور پر ہر سال منعقد ہوتی ہیں۔ ان نشستوں میں اپنی تخلیقات پیش کرنے والوں کو باضابطہ معاوضہ ملتا ہے۔

## ۱۶۔ ادیبوں کی محفلیں

غیر ریاستی اُردو ادیبوں کے اعزاز میں ہر سال اکادمی کئی محفلوں کا اہتمام کرتی ہے۔ یہاں فن اور فنکار کے تعلق سے بات چیت ہوتی ہے اور اس طرح سے ریاست کے اہلِ ذوق کو اُردو دنیا کے مشاہیر کے روبرو ان کے خیالات سے استفادہ کرنے کا موقعہ فراہم کیا جاتا ہے۔ گذشتہ برسوں میں جو لوگ ان محفلوں کے خصوصی مہمان رہے ہیں ان میں جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، مخدوم محی الدین، خلیل الرحمٰن اعظمی، آل احمد سرور، اختر الایمان، جوگندر پال، سردار جعفری، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، شمس الرحمان فاروقی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

## ۱۷۔ دوسری تقاریب

اکادمی نے ایک پروگرام کے تحت اُردو کی برگزیدہ شاعروں اور ادیبوں کی برسیاں منانا شروع کیا ہے۔ پریم چند اور حضرت اقبال کی صد سالہ برسیاں اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ اکادمی کے اہتمام سے ریاست

میں ان بزرگوں کے شایانِ شان محفلیں منعقد ہوئیں اور سمناروں کا اہتمام کیا گیا۔

## ۸:- اُردو ڈرامہ

(ا) اکادمی کی طرف سے اُردو کو موثر ڈھنگ سے مقبول بنانے کے لیے ڈرامے کے وسیلے سے بھی مستحسن کوششیں کی گئی ہیں۔ چنانچہ گذشتہ برسوں میں اکادمی کے زیرِ اہتمام کئی معیاری ڈرامے ہندوستان کے مختلف شہروں میں پیش ہوئے، ان میں زبیر رضوی کا "ٹوٹا ہوا پانچ پیالہ" علی محمد لون کا "جھیل بلا رہی ہے" اور "ہمالیہ کے چشمے" قابل ذکر ہیں۔

(ب) ہر سال ڈراموں کے سکرپٹ کمپٹیشن منعقد ہوتے ہیں جن میں اُردو کے ڈرامے بھی شامل ہیں۔

## ۹:- انعامات اور خلعتِ فاخرہ

(ا) اکادمی ہر سال ریاست میں چھپنے والی بہترین اُردو کتابوں پر دو انعامات دیتی ہے۔ اکادمی کے اعداد و شمار کے مطابق اُردو کتابوں کو -/29,700 روپے کے انعامات مل چکے ہیں۔

(ب) ریاست کے بزرگ شاعروں اور ادیبوں کی ادبی خدمات کے پیشِ نظر انہیں خلعتِ فاخرہ سے نوازنے کا سلسلہ بھی اکادمی نے شروع کیا ہے چنانچہ اب تک رسا جاودانی مرحوم، میر غلام رسول نازکی، اشم زتور کاشمیری اور کشن سمیلپوری کو ان کی اُردو ادبی خدمات کے پیشِ نظر خلعت دیے جا چکے ہیں۔

## دوسرے اقدامات

اُردو خطاطی کے فن کو ترویج دینے کے لیے اکادمی کا شعبۂ خوشنویسی اہم خدمت انجام دے رہا ہے۔ اور اس مٹتے ہوئے فن کو زندہ رکھنے کے لیے قابلِ ستائش کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس تین سالہ تربیتی کورس میں خوشنویسی کا فن سکھایا جاتا ہے۔ اس شعبے نے کئی اچھے خوشنویس پیدا کئے ہیں جو مختلف اخباروں اور اداروں کے ساتھ منسلک ہو گئے ہیں اسطرح سے نہ صرف ایک بڑی کمی دور ہو رہی ہے بلکہ ایسے لوگوں کے روزگار کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ خطاطی کے شعبے میں تربیت پانے والوں کو اکادمی /۷۵ روپے ماہوار وظیفہ دیتی ہے۔ ابھی چند سال پہلے اکادمی نے ملک بھر میں خطاطی کا پہلا کل ہند مقابلہ سرینگر میں منعقد کیا تھا۔

(ب) اُردو ٹائپ رائیٹنگ کیلئے ایک سال کا تربیتی کورس اکادمی نے شروع کیا ہے۔ اس سے ریاست کی ایک دیرینہ کمی پوری ہو گی اور خاص طور پر اردو میں کام کرنے والوں کے لیے آسانی ہو گئی ہے۔

(ج) خطاطی کے قدیم نسخوں کو محفوظ کرنے کے لیے اکادمی نے دو البم "شہرین قلم" کے نام سے چھاپ دیئے ہیں

ریاستی کلچرل اکادمی کی کارکردگیوں کے اس مختصر سے جائزے کے بعد اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس ادارے نے اس ریاست میں حتی المقدور جو کام اُردو کی بقا اور توسیع کے لیے کیا ہے وہ کافی اہم ہے اور اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا، لیکن پھر بھی کچھ کوتاہیاں ہیں جن پر نظر رکھنے اور جن کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ اسطرح سے اکادمی کی سرگرمیاں زیادہ فعال ثابت ہو سکتی ہیں۔ ہماری رائے میں ذیل کی تجاویز پر غور کیا جانا چاہیئے۔

(ا) اکادمی کی طرف سے گذشتہ برسوں میں "اکادمی" کے نام سے ایک خبر نامہ شائع ہوتا تھا۔ یہ خبرنامہ ریاست میں ہونے والی ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کے موثر ڈھنگ سے اطلاعات فراہم کرتا تھا۔ اس خبرنامے کو اکادمی کے ارباب اختیار نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر بند کردیا ہے ہماری رائے میں اسے از سر نو اجراء کیا جانا چاہیئے۔

(ب) اردو شیرازہ پہلے سہ ماہی ہوا کرتا تھا۔ اب سے ماہانہ کردیا گیا ہے ایسے اقدامات فعال ہیں۔ لیکن معلوم نہیں کن دشواریوں کے پیش نظر پرچے کی اشاعت میں تاخیر ہوتی ہے اور پرچہ باقاعدگی سے شائع نہیں ہوتا۔ اکادمی کے ارباب اختیار کو اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

شیرازہ نے اردو کے ادبی حلقوں میں ایک مقام بنایا ہے خاص طور پر اس کے خاص نمبروں میں کافی جان ہوتی ہے۔ پرچے کی اشاعت میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے بہتر ہے کہ اسے دوماہی کردیا جائے۔ اور اس کی ضخامت میں اضافہ ہو۔

(ج) اکادمی کی اردو مطبوعات کے سلسلے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکادمی نے ان کتابوں پر زر کثیر خرچ کیا ہے، خصوصیت کے ساتھ "ہمارا ادب" کے بعض نمبر دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں اور ریاست کی ثقافتی، سیاسی اور سماجی زندگی پر سے بہت سے پردے سرکاتے ہیں مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ ادب، فن، ثقافت، سیاسی اور سماجی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر مستقل کتابیں لکھوائی جائیں۔

(د) ترجمہ کاری کے سلسلے میں اکادمی اقدامات کر رہی ہے۔ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ریاست کی تینوں اکائیوں میں بھرپور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے اردو میں ایسا ادب اور ایسا مواد ترجمہ

کروائے جو یہاں کی مختلف زبانوں کے ذخائر میں موجود ہے۔
(ر) اردو میں ایسی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے جن کا تعلق سماجی علوم، سائنس، فلسفے اور دوسرے علوم سے ہو تاکہ ایسے علوم کے بارے میں اردو کے قارئین کو کما حقہ واقفیت ہو۔
(ز) مغربی اور مشرقی ادبیات کی منتخب کارناموں کو اردو میں منتقل کیا جائے۔
(س) اردو کے نمائندہ کارناموں کو یہاں کے علاقائی زبانوں میں منتقل کیا جائے۔
(ش) اردو میں ایک ایسا انسائیکلوپیڈیا ترتیب دیا جائے جس میں ادبی اصطلاحات کی وضاحت ہو۔
(ص) ریاست کے اردو ادیبوں اور شاعروں کی ایک ڈائریکٹری تیار کی جائے جس میں یہاں کے اردو لکھنے والوں کی سوانحی اشاروں کے ساتھ ان کی ادبی سرگرمیوں کا احاطہ کیا جائے۔
(ض) ریاست کے لکھنے والوں کی کتابوں کی اشاعت کے لیے جو رقم مخصوص ہوتی ہے۔ اس میں موجودہ گراں بازاری کے پیش نظر اضافہ کیا جائے۔ تاکہ زیادہ آسانی سے کتابوں کی اشاعت ممکن العمل ہو۔
(ط) اکادمی ان مسودات کا کھوج لگائے جو ان کے لکھنے والوں یا ترتیب دینے والوں کے انتقال کے بعد گوشۂ تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں۔ پروفیسر سروری مرحوم نے اپنی کتاب "کشمیر میں اردو" میں ایسے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی نشاندہی کی ہے جن کے نام سے بھی آج کوئی واقف نہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے مواد کو اکٹھا کر کے صحت کے ساتھ شائع کیا جائے اور زمانے کے دستبرد سے محفوظ کیا جائے۔ ان اقدامات سے یقیناً اردو کی اشاعت اور فروغ کے لیے ہمارا رول زیادہ کارآمد ثابت ہوگا۔

٭٭٭٭

# ریاست کے تمدنی ادارے

کسی ملک کی ثقافت کو آگے لے جانے میں جہاں اس ملک کے باشعور اور صاحب بصیرت فن کاروں اور دانشوروں کا نمایاں حصہ ہوتا ہے۔ جو وقت کی آہٹ کو اپنی دانش، اپنے قلم اور اپنے فن کے توسط سے ایک نمایاں رنگ عطا کرتے ہیں۔ وہاں بعض ادارے بھی جو انفرادی یا اجتماعی کوششوں سے متشکل ہوتے ہیں اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ یہ رول انفرادی کوششوں سے زیادہ اہم اور زیادہ با اثر ثابت ہوتا ہے اور ثقافتی اقدار کی اشاعت اور ترویج میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس سے کسی ملک کی تہذیبی قدروں کی اشاعت کے سلسلے میں اپنے اداروں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ریاست جموں و کشمیر میں گذشتہ ایک صدی کے دوران ایسے کئی ادارے وقتاً فوقتاً منظر عام پر آئے ہیں۔ جن کی مساعی کو صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ان اداروں نے اپنی کوششوں سے کشمیر کے کلچر اس کے فن اور اس میں پلنے والی تہذیبی اقدار کو عام کرنے میں نمایاں حصہ ادا کیا ہے،

یہ بات قابل ذکر ہے کہ کشمیر کی آواز کو دھیمے لہجے میں ہی سہی ریاست سے باہر کی دنیا میں پہنچانے کی ابتدائی کوشش انیسویں صدی کے اواخر میں ہوئیں۔ ریاست سے باہر ۱۸۸۰ء اور اس کے آس پاس لاہور، دہلی، الہ آباد، جالندھر اور دوسرے شہروں سے اخبارات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اِن اخبارات میں ریاست کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسایل پر مضامین لکھے جاتے تھے، اور اس طرح سے کشمیر کی ثقافت، اس کے تہذیبی رول اور اس کے مسایل کو ریاست سے باہر کی دنیا میں متعارف کئے جانے کی کوششیں ہوئیں۔ ان اخبارات میں خاص طور پر مراسلۂ کشمیر لاہور (۱۸۸۰ء) "اخبار عام" لاہور (۱۸۸۱ء) خیر خواہ کشمیر لاہور (۱۸۸۲ء) کشمیر درپن (الہ آباد ۱۸۹۸ء) کشمیر میگزین لاہور، (۱۹۰۶ء) اور صبح کشمیر لاہور، بہار کشمیر لاہور، کشمیر گزٹ لاہور، پنجہ فولاد لاہور کے نام کافی اہم ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس مساعی میں چند لوگ انفرادی طور پر سرگرم عمل تھے لیکن انہوں نے مجموعی طور پر اپنا اپنا حلقہ بنالیا تھا۔ جس میں نہ صرف یہ کہ کشمیر سے باہر رہنے والے کشمیری بلکہ کشمیر کے پڑھے لکھے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنی آواز سارے ملک میں پہنچانے کی کوشش کرتے تھے اور اسی طرح سے اپنا تشخص منوانے کی یہ ابتدائی سنجیدہ کوششیں تھیں،

تہذیبی اور ادبی اقدار کو ایک ادارے کے ذریعے سے ترویج دینے اور اس سمت میں قابل ذکر سرگرمیوں کی شروعات اس صدی کے اوائل میں منشی سراج الدین احمد خان کی مساعی سے ہوئی۔ انہوں نے مفرح القلوب کے نام سے ایک انجمن تشکیل دی۔ جس کے توسط سے باقاعدگی سے جلسے منعقد ہوتے تھے اور تیرتے ہوئے مشاعروں کا اہتمام ہوتا تھا۔ ان سرگرمیوں سے یہ ادارہ آہستہ آہستہ ایک ثقافتی مرکز بن گیا تھا۔ شیخ عبدالقادر، اور علامہ اقبال جیسے سربرآوردہ لوگ اِن کے چند جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور چودھری خوشی محمد ناظر، محمد حسین عارف، اور مرزا سعدالدین سعد نے اس ادارے میں روح پھونک دی تھی۔

انجمن نصرت الاسلام دوسری انجمن تھی۔ تحریک سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں میں مغربی تعلیم سے استفادہ کرنے کا احساس دلایا تھا۔ کشمیر کے پڑھے لکھے مسلمانوں نے بھی سماجی اصلاح اور دینی خدمات کے ساتھ ساتھ مغربی تعلیم سے اکتساب فیض کرنے کے خیال سے ایک انجمن، انجمن نصرۃ الاسلام کے نام سے قائم کی۔ اس انجمن کے زیر اہتمام سماجی بہبود کے کئی کارنامے انجام پائے۔ مسلمانوں کو دینی اور مغربی تعلیمات سے آراستہ کرنے کیلئے مدارس قائم کئے اور ادبی ذوق کو استحکام دینے کے لئے خاص جلسے اور مشاعرے منعقد کئے۔ ان جلسوں میں منشی امیر الدین امیر، صادق علی خان صادق، محمد الدین فوق، منشی غلام محمد صادق اور منشی غلام محمد خادم اپنی تخلیقات سے سماں باندھ دیتے تھے مشہور ادیب شاعر، مورخ اور نثر نگار پنڈت ہرگوپال کول خستہ بھی ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

انجمن بزم سخن، جموں کی دلنواز فضاؤں میں پروان چڑھی۔ پنڈت دینا ناتھ چکن مست کی سربراہی میں اس بزم نے کافی اچھا کام کیا۔ ہفتہ وار نشستوں کے علاوہ اس بزم کے سالانہ اجتماع قابل ذکر تھے۔ ریاست کے شعرا کے علاوہ باہر سے جوش، اختر شیرانی، محمد الدین تاثیر، فیض، احسان دانش اور دوسرے شعرا، اور اہل سخن ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے، جموں کی تمدنی اور ادبی زندگی میں اس انجمن کی خاصی اہمیت تھی۔ اس کے اجلاس شروع میں صرف جموں خطے تک محدود تھے، لیکن بعد میں سری نگر میں بھی اس کے اجتماع ہوا کرتے تھے۔

"اخوان الصفا" کے نام سے ایک اور بزم سخن مولانا فطرت گیلانی، حیرت کاملی، محمد امین دارلب اور کمال الدین شیدا نے سنواری تھی۔ اس میں بھی ریاستی اور غیر ریاستی ادبا، اور شعراء شریک ہوتے تھے۔ ۱۹۴۲ء کے آس پاس رامانند ساگر، پریم ناتھ پردیسی کی مساعی سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی جس کی ابتدائی نشستیں پریم ناتھ پردیسی کے گھر پر

ہوتی تھیں۔ بعد میں جب اس کا حلقہ وسیع ہو گیا۔ تو ایس پی کالج ہال میں اس کے جلسے منعقد ہونے لگے۔ کشمیر میں ادبی فضا کو ایک سمت دینے میں اس انجمن کا بڑا رول رہا ہے۔ اس کے جلسوں میں ساگر اور پردیسی کے علاوہ خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، محمود ہاشمی وغیرہ شریک ہوتے تھے، مشہور ناقد اور شاعر ڈاکٹر محمد دین تاثیر اس زمانے میں کشمیر کے ایک مقامی کالج میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ انہوں نے اپنے دوران قیام اردو سبھا کے نام سے ایک انجمن تشکیل دی اور اس کے توسط سے اردو شعر و ادب کی خدمات انجام دیں۔ اس طرح مختلف وقفوں کے بعد انجمن ترقی اردو، ینگ رائیٹرس ایسوسی ایشن، انجمن ارباب ذوق، حلقہ علم و ادب، بزم شعراء، کشمیر رائیٹرس لیگ، بزم ادب وغیرہ قائم ہوئیں۔ ان انجمنوں نے بڑے بڑے شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور ڈرامانگار پیدا کئے۔ جو آج ریاست میں ہی نہیں بلکہ ملک کے مقتدر ادباء اور شعراء ناقد اور محققین تسلیم کئے جاتے ہیں۔

ریاست کے تمدنی اداروں میں کلچرل فرنٹ کافی اہم ہے، ۱۹۴۷ء میں کشمیر میں قبائلی درانداز وں کے حملے کے دوران ریاستی ادیبوں شاعروں، دانشوروں اور دوسرے فن کاروں نے ایک ادبی اور ثقافتی محاذ منظم کیا۔ اس تنظیم کی کارگزاریاں سرینگر کے کارونیشن ہوٹل سے شروع ہوئیں، اسی ہوٹل کے کمروں میں، عوام کا لہو گرمانے والے گیت اور نظمیں تخلیق ہوئیں، جنہوں نے ۱۹۴۷ء کے اس پر آشوب دور میں کشمیری عوام کے حوصلوں کو بلند رکھا بعد میں اس ادارے کا دفتر سرینگر کی نمائش گاہ میں منتقل ہوا۔ اور اسے کلچرل کانگریس کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہاں اسے تین شاخوں میں بانٹا گیا۔ جہاں ادب، مصوری اور ڈراما کے ذریعے سے کشمیر کی ثقافت اور ادب کے احیائے نو کا تاریخی رول ادا کیا گیا۔ اس ادارے کے ساتھ مہجور، پردیسی، ماسٹر زندہ کول، دینا ناتھ نادم، نور محمد روشن، رحمان راہی، امین کامل، اختر محی الدین، سوم ناتھ زتشی جیسے

شعراء اور ادباء کے علاوہ خواجہ غلام محمد صادق، موتی لال مصری، پران ناتھ جلالی، غلام رسول سنتوش، ترلوک کول، کاچرو، بنسی پارمو، پران کشور، محمود ہاشمی، علی محمد لون، اور کئی دوسرے سربرآوردہ دانش ور، مصور، ڈراما نگار، اداکار اور ادب اور کلچر کے شعبوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے وابستہ تھے، ہندی کے مشہور نقاد شودھان سنگھ چوہان اور اداکارہ شیلا بھاٹیہ اس ادارے کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ یہ انجمن ہندوستان کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھی۔ اس ادارے کے زیر اہتمام کئی ڈرامے اسٹیج ہوئے۔ جن میں خواجہ احمد عباس کی چودہ گولیاں، محمود ہاشمی کا "یہ کشمیر ہے" اور پریم ناتھ پردیسی کا "شہید شیروانی" قابل ذکر ہے۔ اس انجمن نے اردو اور کشمیری میں کونگ پوش نام کے رسالے بھی شایع کئے۔ ابتداء میں اس انجمن کا ماہنامہ "آزاد" اپنی کارگزاری کے لئے کافی اہم ہے۔

دوسرے تہذیبی اداروں میں ریاستی کلچرل اکادمی کی حیثیت بڑی اہمیت کی حامل ہے، اس ادارے کا قیام ۱۹۵۸ء میں ہوا اور جب سے یہ ادارہ زبانوں کی ترویج واشاعت، فن اور ثقافت سے متعلق دوسرے شعبوں میں اہم رول ادا کر رہا ہے، اس ادارے کے قیام کا مقصد ہی ریاست کے مختلف خطوں کے درمیان ثقافتی رشتے کو استوار کرنا تھا۔ چنانچہ یہ ادارہ گذشتہ برسوں سے ریاست کی مختلف زبانوں کے ادب، موسیقی، رقص، مصوری اور اسٹیج اور ادب اور ثقافت کے مختلف شعبوں کی آبیاری کر رہا ہے، چنانچہ ڈوگری، کشمیری، لداخی، گوجری، ہندی اور اردو ادب کی اشاعت کے سلسلے میں اس ادارے نے جلسوں، مشاعروں، مباحثوں، اور سیمناروں کے ذریعے سے یہ کام انجام دیا ہے اور ساتھ ہی سال ہا سال سے اردو، ہندی، کشمیری اور گوجری میں اپنے ماہنامہ شیرازہ کی وساطت سے یہاں کے تمدن کے پھیلاؤ میں کافی ممد ثابت ہوا ہے، ہمارا ادب، سون ادب اور دوسرے سالانہ مجلّے سارے ملک میں قدر کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اکادمی ہر سال

کتابوں کی اشاعت کیلئے مالی امداد فراہم کرتی ہے اور اچھی کتابوں پر ہر سال انعامات دیئے جاتے ہیں۔ اکادمی کی دوسری ثقافتی سرگرمیاں قابل قدر ہیں، چنانچہ اس کے اہتمام سے ہر سال جشنِ تمثیل منعقد ہوتے ہیں۔ جس میں مختلف زبانوں کے ڈرامے اسٹیج کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اچھے ڈراموں پر انعامات دیئے جاتے ہیں۔ ڈرامے اور اسٹیج کے وسیلے سے ریاست کی ثقافت اور تمدن کے پھیلاؤ میں کافی مدد ملتی ہے۔ اکادمی مصوری، مجسمہ سازی، خوش نویسی، رقص اور موسیقی کی محفلوں کا اہتمام کرتی ہے اور اس سلسلے میں قدیم و جدید میلانات کی عکاسی ہوتی ہے۔

اکادمی کے زیر اہتمام موسیقی اور فنون لطیفہ کا ایک انسٹی ٹیوٹ باقاعدہ طور پر سرگرم عمل ہے۔ جہاں موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ کو بڑھاوا دینے کے لئے قابل قدر کام ہوتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اکادمی نے اپنی ہمہ جہت سرگرمیوں سے ریاست کے تمدنی اداروں میں ایک بلند مقام حاصل کیا ہے۔

ریڈیو کشمیر سرینگر ۱۹۴۹ء میں قائم ہوا۔ ابتدا میں اس کی کارگزاری صرف اردو تک محدود تھی، بعد میں کشمیری، پنجابی، گوجری، ڈوگری زبانوں میں بھی نشریات کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد ریڈیو جموں کے قیام نے نشریات کی تعداد میں اضافہ کیا ہے۔ ہمارے ریڈیو کو ایک سمت اور رفتار دینے میں عظیم فن کاروں کا ہاتھ رہا ہے۔ جن میں بیدی، عباس، پردیسی، سہیل عظیم آبادی، پریم ناتھ در، ٹھاکر پونچھی، موہن لال ایمہ، قیصر قلندر، غلام رسول نازکی، پران کشور، علی محمد لون، کمال احمد صدیقی، جتیندر ادھم پوری، عبدالغنی شیخ، سوم ناتھ سادھو، پشکر بھان، زبیر رضوی، کے کے نیر، میکش کاشمیری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ریڈیو کی نشریات سے نہ صرف ریاست کے مختلف خطوں کی زبانوں کی اشاعت ہوئی ہے۔ بلکہ تاریخ تمدن اور فنون لطیفہ کے دوسرے شعبوں میں بھی نمایاں پیش رفت ہوئی ہے۔ ریڈیو ایک ایسا وسیلہ اظہار

ہے جس کی آواز نہ صرف ریاست کے کونے کونے میں بلکہ ملک اور بیرونِ ملک کے باقی حصوں میں بھی پہنچتی ہے' اس طرح سے ریاست کے دانشوروں' ادیبوں' شاعروں اور تہذیب و تمدن کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہلِ نظر کے خیالات کی ترسیل بہ آسانی ممکن ہو گئی ہے۔ اس طرح سے کشمیر کی تمدنی میراث کی توسیع ہوئی ہے۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ ریڈیو کے پروگراموں کے سامعین کا حلقہ دوسرے تمام تہذیبی اداروں کے مقابلے میں زیادہ وسیع اور پھیلا ہوا ہے اور اس کی حیثیت بذاتِ خود ایک بڑے تہذیبی اور تمدنی ادارے کی ہے۔ یہ ادارہ نہ صرف پڑھے لکھے طبقے کا محبوب ہے بلکہ ان ہزاروں لاکھوں' لوگوں کا بھی محبوب ہے۔ جو تعلیم سے نا آشنا ہے۔ لیکن جن کے کان ریڈیو کی آواز کے منتظر رہتے ہیں۔ ریڈیو کے وسیلے سے لوگ مختلف مسایل سے متعلق آگہی حاصل کرتے ہیں اور اپنی تمدنی میراث اور اپنے عظیم ماضی کے روشن اور تابناک پہلوؤں سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ ریاست کی تمدنی اقدار کی اشاعت میں سرینگر' جموں اور اب لداخ کے ریڈیو اسٹیشنوں کے کارنامے کافی اہم ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ریڈیو کے پروگرام بعض اوقات بعض مصلحتوں کے پیشِ نظر نامکمل اور نا مکتفی یا ناقص بھی ہوتے ہیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے ریڈیو کی کارگزاری کو صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

ٹیلی ویژن ہماری ریاست کا ایک اور ثقافتی ادارہ ہے۔ سرینگر دوردرشن کی نشریات کا آغاز ۱۹۷۳ء سے ہوا۔ اس لحاظ سے یہ ادارہ نہایت کم عمر ادارہ ہے گو ابھی اس اسٹیشن کو مناسب ساز و سامان سے لیس نہیں کیا گیا ہے۔ جس کے باعث اس کی نشریات ناکافی ہیں۔ پھر بھی آہستہ آہستہ اس کے پروگرام اور نشریات کا دائرہ پھیلتا جا رہا ہے۔ اس میں پروگراموں کی خاصی تعداد ایسی ہے۔ جن کا تعلق براہِ راست ہمارے کلچر سے ہے۔ ان میں خاص طور پر ایسے پروگرام اہم ہیں۔ جو کاشکاروں

کے لئے، بچوں کے لئے، نوجوانوں کے لئے یا ادب و ثقافت سے متعلق ہوتے ہیں۔ کشمیری، ڈوگری اور لداخی، موسیقی، رقص، اور لوک سنگیت کے پروگرام بھی اس سمت میں پیش ہوتے ہیں۔ کشمیر کی زندگی سے متعلق اردو اور کشمیری میں فلمیں اور ڈرامے بھی برابر پیش ہوتے ہیں۔ ریاست کے مختلف خطوں سے متعلق دستاویزی فلموں کی نمائش ہماری زندگی کے بعض نمایاں پہلوؤں کو پیش کرنے کا اچھا اقدام ہے۔ یہ پروگرام نہ صرف وادی میں بلکہ جموں اور پاکستان کے بعض حصوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

ان اداروں کے علاوہ ریاستی محکمہ اطلاعات بھی اہم ادارہ ہے۔ جو برس ہا برس سے تمدن اور ثقافت کے متعلق سے قابل قدر کام کرتا چلا آیا ہے۔ محکمہ اطلاعات کی طرف سے تعمیر (اردو) کشمیر ٹوڈے (انگریزی) یوجنا (ہندی) جیسے ماہنامے اور مکتوب (اردو) کے نام سے ایک خبرنامہ باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ جن میں دوسری باتوں کے علاوہ ریاست کی تمدنی اور ثقافتی زندگی سے متعلق مضامین، افسانے، ڈرامے نظمیں اور دوسری اطلاعات شائع ہوتی ہیں۔ ان جرائد میں خاص طور پر ماہنامہ "تعمیر" کا رول قابل ذکر ہے۔ تعمیر اپنے دور اولین میں ظفر پیامی کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ لیکن اس کے صرف ایک یا دو شمارے شائع ہوئے تھے، دوسرے دور میں اسے شمیم احمد شمیم اور محمد یوسف ٹینگ نے نیا آہنگ بخشا۔ اس دور میں اس کے مہجور نمبر اور آزاد نمبر شائع ہوئے تھے، جن کی دستاویزی اہمیت ہے۔ تیسرے دور میں خالد بشیر کی ادارت میں اس کا جموں و کشمیر میں اردو ادب نمبر شائع ہوا ہے۔ جو خاصے کی چیز ہے، مجموعی طور ان جرائد نے ریاست کے کلچر، فن، ادب اور زندگی کے دوسرے شعبوں کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

محکمہ اطلاعات کا ایک اور شعبہ فیلڈ پبلسٹی کا شعبہ بھی ہے۔ جس کا جال ساری ریاست میں پھیلا ہوا ہے۔ اس شعبے کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً شہروں کے علاوہ دور دراز دیہاتوں

میں مشاعرے منعقد ہوتے ہیں اور فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ دیہاتوں میں خاص طور پر اس محکمے کی کارکردگی زود اثر ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ فلموں کے ذریعے سے ان علاقوں کے ناخواندہ اور نیم پڑھے لکھے لوگوں تک نہ صرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے نئے دریچے کھل جاتے ہیں۔ بلکہ ریاست کی ثقافتی زندگی اور ماضی کی شاندار روایات کے تعلق سے سود مند باتیں پہنچائی جاتی ہیں اور اس طرح سے انہیں ریاست کی تمدنی زندگی سے جانکاری ہوتی ہے۔

سرینگر اور جموں کے عجائب گھر اور جموں کی ڈوگرہ آرٹ گیلری کی حیثیت بھی تمدنی اداروں سے کم نہیں۔ ان اداروں میں زمانہ قدیم سے لے کر آج تک مختلف آثار زبان حال سے اپنی حقیقت منواتے ہیں۔ یہاں پر ہندو عہد، بودھ عہد، افغانوں، مغلوں، سکھوں اور ڈوگروں کے عہد کے قدیم آثار ملتے ہیں۔ جو اپنے اپنے عہد اور اپنے زمانے کی تہذیب اور تمدن کی واضح نشاندہی کرتے ہیں۔ ان اداروں میں مجسمہ سازی، مصوری اور خطاطی کے بے شمار نمونے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف زمانوں کے ملبوسات، سکے، ہتھیار، پتھر اور روزمرہ زندگی کے دوسرے متعلقات محفوظ کئے ہیں۔ جو اس ریاست کے گزشتہ روز وشب کی داستان سناتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر چیزیں کھدائی سے دستیاب ہوئی ہیں۔ خطۂ جموں میں اکھنور اور خطۂ کشمیر میں ہارون، برزہامہ اور دوسرے مقامات سے اکٹھا کئے ہوئے مختلف آلہ جات، ہتھیار، مورتیاں، مجسمے، مصوری کے نمونے بڑی تہذیبی اہمیت کے حامل ہیں۔ عجائب گھروں میں قدیم بادشاہوں اور مہاراجوں کے جاری کردہ سکے، مسودات، شاہی فرامین، مخطوطات، ملبوسات چرند و پرند کے ڈھانچے اپنی خاموش زبان سے تاریخ کے اوراق پر لکھی ہوئی بے شمار کہانیاں سناتی ہیں۔ یہ تمام ساز و سامان تاریخ اور تمدن پر سے اقتدار زمانہ کی گرد ہٹاتا ہوا ان کی واضح شکل ہمارے سامنے

رکھ دیتا ہے۔ آج بھی سینکڑوں لوگ ماضی کے اِن دفینوں کو جا کر اپنی کھلی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور ماضی کی یادوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ تمدن، ثقافت اور انسانی زندگی کے شب و روز کی صدیوں پرانی باتیں صرف کہانیاں نہیں رہتیں بلکہ ٹھوس اور مجرد پیکر اختیار کر کے سامنے آجاتی ہیں۔ یہ ادارے ریاست کی تمدنی تاریخ میں ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو خاموشی سے ایک بہت بڑا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

اس مختصر سے مضمون میں ریاست کے تمدنی اداروں کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ یہاں صرف چند نمایاں اداروں کی کارگزاری پر مختصر اشارے کئے گئے ہیں۔ ناانصافی ہوگی۔ اگر ان اداروں کا ذکر نہ کیا جائے۔ جن کی عمر کم سہی اور اگرچہ ان کا براہ راست تعلق اور دائرہ عمل کا ذکر نہ کیا جائے ریاست کے تمدن کے ساتھ نہیں ہے لیکن ان کی کارگزاریوں کو صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ میرا اشارہ جموں اور کشمیر یونیورسٹی کی طرف ہے، جہاں ایسے شعبے قائم ہوئے ہیں، جن میں اپنے متعلقہ تدریسی خدمات کے علاوہ تمدن کے تعلق سے خاصا کام ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں کشمیر یونیورسٹی کا شعبہ وسط ایشیائی مطالعات کا مرکز، کشمیری، فارسی، ہندی اور اردو کے شعبہ جات اور جموں یونیورسٹی میں ڈوگری، سنسکرت ہندی اور اردو کے شعبے بھی اپنی بساط کے مطابق کام کرتے ہیں۔ ان کی توسیع سے ریاست کی تمدنی اور تہذیبی زندگی کی ترجمانی کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں ؛

-:-:-:-:-:-

# جموں و کشمیر میں اُردو ادب کے نمائندہ فنکار

## ہرگوپال خستہ (۱۸۴۸ - ۱۹۲۳ء)

کشمیر میں اردو کے معماروں میں ہرگوپال کول خستہ اور ان کے بھائی سالگرام سالک کو درجۂ امتیاز حاصل ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہدِ حکومت میں ہی اردو اپنا منصب منوانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اردو میں شعر و نثر کے ذریعے اظہارِ خیال ہونے لگا تھا۔ اس زمانے میں کشمیری ادیبوں کے تعلقات ریاست سے باہر کے ادیبوں اور دانشوروں سے پیدا ہونے لگے تھے۔ مہاراجہ خود بھی علم دوست اور عالموں کے قدردان تھے۔ اس لئے اردو کی ترقی کے امکانات روشن ہوئے حتیٰ کہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد کے آتے ہی یہ زبان ریاست کی درباری زبان قرار دی گئی۔

پنڈت ہرگوپال کول کے اجداد سکھوں کے عہدِ حکومت میں ترکِ وطن کرنے پر مجبور ہوگئے تھے اور عرصۂ دراز تک پنجاب کے مختلف شہروں میں آباد تھے لیکن ان کے تعلقات کشمیر سے برابر قائم تھے۔ پنجاب کے مختلف شہروں میں کافی

عرصہ گزارنے کے بعد یہ خاندان پٹیالہ منتقل ہو گیا اور عرصہ دراز تک یہیں مقیم رہا۔ ہرگوپال کول کی ولادت ۱۸۴۰ء کے آس پاس لاہور میں ہوئی اور یہیں انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ پٹیالہ کے ایک اسکول میں درس و تدریس کا کام کرتے رہے۔ یہیں پر ان کے تخلیقی ذہن کو ہوا ملی۔ خستہ، شبلی اور حالی کے معاصر تھے۔ شعر و ادب کے ساتھ دلچسپی ہونے کے علاوہ وہ صحافت کے ساتھ خاص طور پر شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ قیام لاہور کے دوران وہ راوی، ریفارمر، خیر خواہ کشمیر، دیش کی پکار اور اس قبیل کے کئی پرچوں کے ساتھ وابستہ رہ چکے تھے۔ لاہور میں ان کا تعارف پنجاب کے ڈائریکٹر تعلیمات کرنل ہالرائیڈ کے ساتھ ہو چکا تھا۔ وہ انجمن پنجاب کی کارکردگیوں سے بھی واقف تھے۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ وہ اپنے عہد کے نئے خیالات اور تصورات سے واقف ہو چکے تھے بلکہ اردو زبان کے مزاج سے بھی واقف تھے۔ خستہ اعلیٰ پایہ کے شاعر اور نثر نگار تھے۔ اس زمانہ میں کشمیر میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کی حکومت تھی۔ مہاراجہ ایک روشن خیال حکمران اور علم و فن کا قدردان تھا۔ خستہ اور ان کا خاندان مہاراجہ کے حالات اخبارات میں ادھر ادھر پڑھ چکا تھا۔ چنانچہ وہ انیسویں صدی کے ساتویں دہے میں اپنے خاندان کے ساتھ کشمیر لوٹے اور چونکہ بڑے تیز ذہن کے مالک تھے۔ اسلئے بجلد ہی مہاراجہ کے دربار کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ انہوں نے کشمیری پنڈت فرقے کی قیادت بھی ہاتھ میں لے لی۔ وہ ان خیالات سے اپنے فرقے کو فیض یاب کرانا چاہتے تھے جو انہوں نے قیام پنجاب کے دوران حاصل کر لئے تھے۔

خستہ کے کئی نثری کارنامے ہیں۔ ان کی "گلدستہ کشمیر" اردو نثر میں غالباً کشمیر کی پہلی تاریخ ہے۔ جو عہد قدیم سے لیکر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد کا احاطہ کرتی ہے یہ کتاب ۱۸۸۳ء میں لاہور سے شایع ہوئی۔ خستہ رنبیر سنگھ کے عہد کے چشم دید گواہ تھے۔ اس لیے تاریخی اعتبار سے بھی اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔ کتاب نہایت

شستہ اور صاف ستھری زبان میں لکھی گئی ہے اور اس ثقالت سے پاک ہے۔ جو اس سے قبل کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ اردو کے نثری شعبے میں یہ قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ خستہ کی دوسری تصنیف رسالہ "گلزار فوائد" ہے۔ یہ دراصل ایک قصہ ہے جس میں ڈپٹی نذیر احمد کے مراۃ العروس کا "تتبع" کیا گیا ہے۔ اسلوب سلیس اور واضح ہے۔ کہیں کہیں مقفیٰ اور مسجع عبارت کا التزام کیا گیا ہے۔ خستہ کے کارناموں میں اُن کے انشایئے بھی شامل ہیں۔

"مثنوی گوپال نامہ" خستہ کا ایک اور کارنامہ ہے۔ یہ مثنوی قلعہ باہو کے قیدخانے میں لکھی گئی ہے جس میں کشمیر کے قحط، مہاراجہ رنبیر سنگھ کی بدظنی، اس کے دربار کی سازشوں کا حال اور اپنے قید کئے جانے کی تفصیل درج ہے۔ یہ مثنوی ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔
خستہ کی ایک طویل نظم "نرسنگھ اوتار" ہے۔ یہ نظم مثنوی کے فارم میں کہی گئی ہے۔ اور اس دور کے سیاسی و سماجی حالات کا احاطہ کرتی ہے۔ گلدستہ کشمیر کے دیباچے میں انہوں نے اپنی کچھ اور تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ جس میں ایک مختصر جغرافیہ کشمیر بھی تھا۔ جو ان کے مطابق مطبع بہار کشمیر لکھنؤ میں شایع بھی ہوا تھا۔ ان کی دوسری تصانیف میں شگفتہ بہار، گل بہار، مثنوی ہی مال ناگرائے، چہار گلزار اور سوانح عمری خستہ بھی شامل ہیں۔ یہ سب تصانیف نایاب ہیں۔

ہرگوپال خستہ غزل بھی کہتے تھے۔ ان کی غزلوں میں وہ پختگی اور صناعی نہیں ملتی جو اس دور میں اردو کے پختہ مشق شعرا کے یہاں نظر آتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا رجحان طبع دراصل مثنوی کی طرف تھا۔ اور نثر اور صحافت سے انہیں طبعی وابستگی تھی۔ پروفیسر سروری کے حوالے سے اُن کی غزل کے یہ شعر نمونے کے طور پر پیش ہیں:۔

کیا بتائیں جہاں میں کیا دیکھا — ہر طرف جلوۂ خدا دیکھا

| | |
|---|---|
| ؎ ہم نے دنیا کو آزما دیکھا | جس کو دیکھا، غرض فنا دیکھا |
| ؎ کیا بھروسہ ہے دم کا اے آدم | دم تو ہر دم گیا ہوا دیکھا |
| ؎ بجستبہ بیرزال دنیا میں | آشناؤں کو ڈوبتا دیکھا |
| ؎ خوب ڈھونڈا جہاں میں اے خستہ | خستگی کا نہ آشنا دیکھا |

ذکر ہو چکا ہے کہ خستہ کی تربیت لاہور میں ہوئی تھی۔ اسلئے وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کافی دسترس رکھتے تھے۔ اس زمانے تک آتے آتے پنجاب میں اردو خاصی آسان اور رابطے کی زبان بن چکی تھی اور اس نے علمی اور ادبی مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ خستہ جب کشمیر آئے تو اپنے ساتھ اس میراث کو بھی لے آئے۔ ان کی زبان مقابلتاً صاف سلجھی ہوئی اور منجھی ہوئی تھی۔ چنانچہ انہیں کشمیر یا کشمیر سے باہر جب بھی اظہارِ خیال کرنے کا موقعہ ملا تو انہوں نے اسی زبان کا سہارا لیا اور اپنے فرض کو بدرجہ احسن انجام دیا۔

ہرگوپال کول نہ صرف مورخ اور شاعر تھے بلکہ وہ گفتار کے غازی بھی تھے۔ انہیں اپنے کشمیری ہونے کا زبردست احساس تھا لہٰذا وہ اپنے عہد کے تناظر میں کشمیریوں کے حقوق دلانے کے لئے برسرپیکار رہے۔ وہ ڈوگرہ درباروں کے ساتھ وابستہ ہونے کے باوجود مہاراجوں اور ان کے حاشیہ برداروں کی خوشامد نہیں کرتے تھے۔ بلکہ سلیقے سے ان کی زبردست تنقید بھی کرتے تھے۔ حق بات تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے قیمتی شب و روز نہ صرف اپنی تقریر سے بلکہ اپنی تحریر سے اپنے وطن اور قوم کے لئے صرف کی۔ ان کا انتقال ۱۹۲۳ء میں سرینگر میں ہوا۔

●

## پنڈت سالگرام سالک (۱۸۵۷ء — ۱۹۲۹ء)

پنڈت سالگرام سالک، ہرگوپال کول خستہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ اس

عہد کے دوسرے اہم نثر نگار ہیں۔ سالکؔ ۱۸۵۷ء میں لاہور میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں کی ادبی فضاؤں میں ان کا ذوقِ سلیم پروان چڑھا تھا۔ سالکؔ شروع سے ہی بڑے ہونہار اور تیز ذہن کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم پٹیالہ میں حاصل کی اور اپنی درسیات امتیاز کے ساتھ تکمیل کیں۔ سالکؔ اردو اور فارسی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم پانے کے باعث ان زبانوں میں خاصی دستگاہ رکھتے تھے۔ انہوں نے پٹیالہ کے کالج میں انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کر لی تھی۔

سالکؔ کو ابتدا سے ہی شعر و ادب سے خاصا شغف تھا۔ چنانچہ ان کے مضامین اودھ اخبار لکھنو اور مراسلۂ لکھنو میں شایع ہوتے تھے۔ اپنے خاندان کے ساتھ وہ بھی مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہدِ حکومت میں کشمیر آئے۔ اپنے بھائی ہر گوپال خستہ کی سفارش سے وہ ریذیڈنسی میں ملازم ہو گئے۔ لیکن بعد میں کشمیر دربار کی سازشوں کے شکار ہو کر انہیں اپنے بھائی کے ساتھ قلعہ باہو میں قید کر لیا گیا۔ جہاں سے وہ بعد میں بھاگ گئے۔ پنڈت سالگرام کو صحافت سے بڑی دلچسپی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ۱۸۸۰ء میں کشمیر سے اخبار جاری کرنے کی اجازت سرکار سے مانگی تھی، جو نہیں مل سکی۔ یہ غالباً ریاست سے اخبار نکالنے کی سب سے ابتدائی کوشش تھی۔ لیکن بعد میں جب وہ لاہور پہنچے تو انہوں نے ۱۸۸۴ء میں لاہور سے "خیر خواہِ کشمیر" کے نام سے ایک اردو ہفتہ روزہ جاری کیا جس کے ساتھ ان کے بھائی بھی وابستہ تھے۔ اسی عہد میں عیسائی مشنریوں اور مبلغوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور مغربی خیالات کی توسیع ہونے اور عیسائیت کی تبلیغ کو روکنے کے لئے مختلف مذاہب کے پڑھے لکھے لوگوں میں ہلچل پیدا ہوئی۔ آریہ سماج نے بھی اپنی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں۔ سالک سناتن دھرم عقیدے کے حامی تھے۔ اس زمانے میں کشمیر میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ گدی نشین ہو چکے تھے جو خود سناتن دھرم کے بڑے حامی تھے چنانچہ ان کے بلاوے

پر سالک کشمیر آئے اور انہوں نے سناتن دھرم سبھا کا کام سنبھالا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے آریہ سماجی پرچار کے خلاف اور سناتن دھرم کی حمایت میں اردو میں کئی کتابچے لکھے جن میں خاص طور پر "مورتی منڈن" "دھرم اپدیش" اور شاستر ارتھ قابلِ ذکر ہیں۔
سالک نے اپنی زندگی میں کئی پیشے اختیار کئے۔ آخری زمانے میں وہ وکالت کرنے لگے تھے جس کے باعث انہیں قانونی موضوعات پر لکھنے کے مواقع میسر ہوئے۔
دراصل سالک بنیادی طور پر ایک شاعر اور نثر نگار تھے۔ اسلئے جہاں جس حیثیت میں کام کیا وہ اپنے احساسات اور ردعمل کو شعر و نثر کے قالب میں ڈھالتے رہے وہ بڑے زود نویس تھے، اپنے عہد کے لکھنے والوں میں ان کا درجہ اسلئے بھی بلند ہے کہ انہوں نے اردو کی ترقی اور بقا کے لئے ایک زبردست تعمیری رول ادا کیا۔ وہ زندگی بھر پنجاب اور کشمیر میں گھومتے رہے لیکن زندگی کا آخری زمانہ سری نگر میں گزارا۔ جہاں اُن کا شمار اچھے وکیلوں میں کیا جانے لگا تھا۔ ان کا انتقال ۱۹۲۹ء میں سری نگر میں ہوا۔
ذکر ہو چکا ہے کہ سالک کو صحافت سے گہری دلچسپی تھی۔ سری نگر کے قیام کے دوران انہوں نے سالگرام پریس کے نام سے ایک پریس بھی قایم کیا تھا۔ اور اس پریس سے کئی قانونی کتابیں اور اپنا اخبار وکیل شایع کرتے تھے۔ وہ کئی کتابوں کے منصف تھے۔ جن میں سے بعض کتابیں شایع ہو چکی ہیں اور بعض ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ اُن کی چند اہم نثری تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ سوانح عمری مہاراجہ گلاب سنگھ

یہ کتاب دراصل مہاراجہ گلاب سنگھ کی حیات کا جو انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے اردو ترجمہ ہے۔

۲۔ شاستر ارتھ ۳۔ مورتی منڈن ۴۔ دھرم اپدیش

یہ مختصر سے رسالے سناتن دھرم کی حمایت میں لکھے گئے تھے۔

۵۔ جنگ یورپ کا عبرتناک منظر۔ ۱۹۱۴ء میں سالگرام پریس سے شایع ہوئی۔

۶۔ خطرۂ تعلیم :۔ یہ رسالہ تعلیم نسواں کے مخالفوں کے جواب میں لکھا گیا تھا اور لاہور سے شایع ہوا تھا۔

۷۔ رسالہ حق پرستی :۔

یہ رسالہ بھی سناتن دھرم کی حمایت میں شایع ہوا تھا۔

سالک نے چونکہ قانون کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔ لہذا انہوں نے اس شعبے سے متعلق بھی کئی چھوٹی بڑی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں شرح رنبیر ڈنڈ بدھی' (ترجمہ قانون تعزیرات جموں و کشمیر کی مبسوط شرح) اس ضمن میں ان کا خاص کارنامہ ہے۔ شرح ضابطہ دیوانی، شرح قانون رسوم واسٹامپ، شرح قانون معیاد سماعت شرح قانون اجرائے ڈگری' ان کے علاوہ اور بھی کئی قانونی رسالوں اور دستاویزات کی شرح لکھی۔ خالص ادبی کارناموں میں سالک کی کئی تصانیف اہم ہیں۔ جن میں گنجینۂ فطرت یا مناظر فطرت یہ اپنی طرز کے بہت ہی فطری اور سلیس اسلوب میں لکھے ہوئے انشائیے ہیں جن میں کشمیر کے مناظر کا بیان ملتا ہے۔

داستان جگت روپ بھی سالک کا ایک اور کارنامہ ہے۔ یہ کتاب قصہ کے پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ جو کسی وجہ سے شایع نہ ہو سکی۔

تحفۂ سالک ان کا ایک سفر نامہ ہے۔ جس میں دوسرے ممالک کی تواریخ اور جغرافیہ کا سہارا لے کر وہاں کی ترقی کا حال لکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں قصے کی تکنیک کا التزام کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ انہوں نے کشمیری ریڈر، کشمیری لغت اور قواعد بھی لکھے تھے۔ جو مختلف وقتوں میں شایع ہوئے

سالگرام نے اردو کے قواعد اور لغت کی تدوین پر بھی قابلِ قدر کام کیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں علم و ادب سے کس قدر شغف تھا۔

سالگرام سالک شاعر بھی تھے اور انہوں نے نظم، مثنوی، غزل قطعات اور تاریخوں کا ایک خاصہ ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ ان کی مستقل تصانیف میں اردو کا ایک دیوان اور ایک مثنوی سندر بدن درجہ امتیاز رکھتی ہے۔ انہوں نے ایک اور مثنوی سسی پنوں بھی لکھی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کافی زود نویس تھے اور زندگی بھر انہوں نے تصنیفی اور تالیفی زندگی بسر کی۔ سالک ایک اچھے شاعر تھے اور انہیں شعر گوئی کے فن پر قدرت حاصل تھی۔ ان کے یہاں بعض اچھے شعری نمونے نظر آتے ہیں۔ مثلاً

؎ کسی نے کیا ترے کانوں میں ہے اے جانِ جہاں پھونکا
کہ مجھ کو دیکھ کر گلشن میں تو نے گلستاں پھونکا

؎ قبلہ دل میں مرے گھر ہے بتوں کا سالک
بت ہے کعبہ میں میرے کعبہ ہے بت خانے میں

؎ غبارہ میں اڑا جب وہ تو حیرت میں فلک پر سے
ادھر سے آفتاب آیا ادھر سے ماہتاب آیا

؎ نہیں ہے گر یہ تنہا منبع تو کیا ہے پھر سالک
کہ دانہ نخل ہوا اور نخل دانہ ہوا

۱۰ ؎ بال شیشے میں جو آ جائے تو جڑ جاتا ہے
دل جو ٹوٹا تو کسی طرح ملایا نہ گیا

؎ عجب ناداں ہیں جو جاتے ہیں مسجد یا کہ مندر میں
کلیسا میں، حرم میں، دیر میں سالک میں ہر جا ہوں

؎ لامکاں تک بھی گیا میں، خلا کی بھی سیر کی
پر ملا اب تک نہیں مجھ کو نشانِ کوئے دوست

## منشی محمد الدین فوق (۱۸۷۷ء — ۱۹۴۵ء)

کشمیر کے اردو خدمت گزاروں میں محمد الدین فوق کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ فوق نے زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر سے باہر پنجاب کے مختلف شہروں میں گزارا لیکن انہوں نے زندگی بھر کشمیر سے گہری وابستگی کا اظہار اپنی تحریروں میں کیا۔ محمد الدین فوق کشمیری الاصل تھے۔ ان کے والد کسی زمانے میں پونچھ کے قصبے میں پٹواری کا کام کرتے تھے۔ فوق ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ واجبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد محکمہ پرمٹ جموں میں ان کا تقرر ہوا تھا۔ لیکن بعد میں وہ ملازمت ترک کر کے پنجاب چلے گئے اور "پیسہ اخبار" میں ملازم ہو کر اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ زندگی کے آخری دنوں میں اکثر بیمار رہا کرتے تھے۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء میں سری نگر سے لاہور واپس پر ان کا انتقال ہوا۔

محمد الدین فوق کا شمار کشمیر کے بڑے ادیبوں اور شاعروں میں کئے جانے کا مستحق ہے۔ وہ ایک قابل قدر مورخ، صحافی، تذکرہ نگار، اور نثر نگار تھے۔ انہوں نے متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا۔ ناول، افسانہ، سوانح، تذکرہ، تاریخ اور شاعری کے مختلف شعبوں میں ان کے متعدد کارنامے موجود ہیں۔ اس لحاظ سے ان کو اپنے عہد کا بہت ہی قدآور ادیب، شاعر اور صحافی ماننے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ ان کی تصانیف کی تعداد لگ بھگ سو تک پہنچتی ہے۔ فوق کشمیر کے وہ جیالے سپوت تھے۔ جس نے کشمیر میں اور کشمیر سے باہر کشمیر کی صحیح ترجمانی کرنا اپنا ایمان سمجھا اور نہایت ہی شستہ اور سلیس انداز میں کشمیر کے ماضی اور حال سے بیرونی کشمیر کے لوگوں کو روشناس کرانے کے لئے قلم کا سہارا لیا اور بیسویں صدی کے اوائل میں اردو دنیا میں دھوم مچادی۔ فوق کا پہلا عشق اخبار نویسی تھا۔ اسلئے وہ زندگی بھر کسی نہ کسی صورت میں کشمیر اور کشمیر سے باہر پنجاب میں مختلف اخبارات کے ساتھ وابستہ رہے۔ صحافت کا

پہلا سبق انہوں نے "پیسہ اخبار" میں سیکھا۔ اس کے بعد وہ اخبار کوہ نور کے حلقہ ادارت میں شامل ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں انہوں نے اپنا اخبار "پنجۂ فولاد" لاہور سے ہی جاری کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ کشمیری گزٹ کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ برسوں کے بعد انہوں نے کشمیر میں ایک پریس قایم کرنے اور اخبار جاری کرنے کی زبردست کوشش کی۔ جسے رد کر دیا گیا۔ مایوس ہو کر واپس لاہور چلے گئے اور اپنا ماہنامہ "کشمیری میگزین" جاری کیا۔ جو کشمیریات سے متعلق تھا۔ اس کے علاوہ وہ کشمیری اخبار اور ماہنامہ "طریقت" کے ساتھ بھی وابستہ رہے۔ نثر کے شعبے میں فوق نے قابل قدر کارنامے انجام دیئے۔ ان میں جیسا کہ ذکر ہوا تاریخی، سوانحی اور قصہ کہانیوں کی تصانیف بھی شامل ہیں۔ ان کی اہم تصانیف میں تاریخ اقوام کشمیر (تین جلدوں میں)، تاریخ بڈشاہی، تذکرہ رہنمایان ہنود تذکرۂ صوفیائے لاہور تاریخ کشمیر (۲ جلد) مہر نیم روز کشمیر، راجہ سکھ جیون مل، کشمیر کی رانیاں، شباب کشمیر، خواتین کشمیر، تذکرہ اخبار نویساں، تذکرہ شعراء لاہور، یادِ رفتگاں، تاریخ کا روشن پہلو، رہنمائے کشمیر، ریاست میں اردو فکشن کی طرف فوق نے ہی سب سے پہلے توجہ دلائی۔ اگر یہ کہا جائے کہ کشمیر میں باضابطہ طور پر انہوں نے اردو فکشن کی طرح ڈالی تو بے جا نہیں ہوگا۔ فوق نے جیسا کہ ذکر ہوا روشن زمانہ کے مطابق کئی تاریخی اور نیم تاریخی قصے قلم بند کئے۔ جنہیں ہم ریاست میں اردو فکشن کے اولین نقوش کہہ سکتے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس سلسلہ میں کس سے متاثر ہوئے لیکن بہر حال ان کی طبع زاد قصوں میں کہانی کا بنیادی کینڈا ضرور ملتا ہے۔

ناول نگاری کی طرف سالگرام سالک کے ساتھ ساتھ مولوی محمد الدین فوق نے بھی شروعات کیں۔ سالک کی تصنیف داستان جگت روپ ناول سے زیادہ ایک داستان ہے اور اس میں پلاٹ در پلاٹ کی تکنیک کا التزام کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس مولوی محمد الدین کی اس سلسلہ میں بہتر کوشش ملتی ہیں۔ ان

کے یہاں فکشن کے شعبے میں کئی قصے ملتے ہیں لیکن ان میں خاص طور پر اکبر اور انار کلی نام کے دو تاریخی قصے اہم ہیں۔ جن کو ہم بیسویں صدی کے دوران لکھے ہوئے اولین اردو ناول کہہ سکتے ہیں۔ انار کلی سنہ ۱۹۰۰ء میں اور اکبر سنہ ۱۹۰۹ء میں لاہور سے شایع ہوئے۔ فوق نے انار کلی کے دیباچے میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ اس ناول کا پلاٹ فرضی نہیں تحقیقی ہے اور اس کی تواریخی شہادت ہے۔ اس زمانے میں ابھی امتیاز علی تاج نے اپنا شہرہ آفاق ڈرامہ انار کلی نہیں لکھا تھا۔ فوق کے دوسرے ناولوں میں ناکام ناصح مشفق، غریب الدیار، نیم حکیم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کا ناول اکبر نسبتاً زیادہ اچھا ہے اور فوق خود اس کو درجہ امتیاز دیتے تھے۔ اور اسی طرح فکشن کے شعبے میں سبق آموز کہانیاں (افسانے) انار کلی اور اکبر جیسے ناول لکھ کر اس شعبے میں بھی چراغ روشن کیے۔ اس لیے ان ہزاروں اوراق پر فوق کے تخلیقی ذہن کی نشان دہی ہوتی ہے۔ وہ اس میدان میں یقیناً ایک رہنما اور ایک پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کے نقش قدم پر چل کر کشمیر میں اردو کے لکھنے والوں نے اپنے چراغ روشن کیے۔

فوق ایک بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ اور ان کے تعلقات اپنے وقت کے بڑے شاعروں کے ساتھ بھی تھے۔ جن میں خاص طور پر علامہ اقبال کا نام لیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی۔ اُن کا مجموعہ کلام "کلام فوق" کے عنوان سے شایع ہو چکا ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

؎ کس ہستی موہوم پہ غافل یہ تکبر
انتا تو سمجھو کوئی رہے گا نہ رہا ہے

؎ میں وہ کہ ترے ظلم و ستم پر بھی دعا گو
تو وہ کہ مرے عجز و وفا پر بھی خفا ہے

ہ آ، اور مری چشم تصور میں سما جا
آئینہ ترا دیر سے بے عکس پڑا ہے

ہ کشمیر جسے کہتے ہیں سب غیرت فردوس
جب تو ہی نہیں پاس تو دوزخ سے سوا ہے

•

## نندلعل طالب کاشمیری (۱۸۹۹ء ــــ ۱۹۷۱ء)

پنڈت نندلعل کول جو بعد میں طالب کاشمیری کے نام سے پورے ملک کے ادبی حلقوں میں مشہور ہوئے، ابتدا میں دلبر تخلص کرتے تھے۔ وہ کشمیر کے ایک ذی اثر اور پڑھے لکھے کشمیری پنڈت گھرانے میں ۲۵، دسمبر ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کے ایک بزرگ پنڈت رگھوناتھ کول کسی زمانے میں بڑے صاحب اقتدار تھے۔ ان کے بزرگ فارسی، عربی اور سنسکرت میں کافی دسترس رکھتے تھے۔ بزرگوں سے ملی ہوئی اسی میراث نے نندلال کو بچپن سے ہی شاعری کی طرف مائل کیا اور انہوں نے اردو اور فارسی ادبیات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ طالب نے ابتدائی تعلیم عیسائیوں کے کرسچن مشنری اسکول میں پائی۔ بعد میں اردو اور فارسی کے اعلیٰ امتحانات پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کامیاب کئے۔ طالب عرصہ دراز تک ریاست کے مختلف کالجوں میں اردو اور فارسی کی درسیات دیتے رہے۔ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ریاستی کلچرل اکادمی کے شعبہ لغت کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۷۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔

طالب نے شعر گوئی کا آغاز زمانۂ طالب علمی سے ہی کیا تھا۔ انہیں اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی خاصی دستگاہ حاصل تھی۔ شروع میں انہوں

نے دلبر تخلص کیا۔ چنانچہ ان کا کلام ۱۹۱۲ء سے برابر غیر ریاستی اخبارات اور جرائد میں دلبر کے ہی تخلص سے نظر آتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ریاست سے کوئی اخبار شایع ہنیں ہوتا تھا۔ ان کا ابتدائی کلام اخبار عام' بہار کشمیر' صبح کشمیر' گلشن 'نظام' جیسے لاہور سے چھپنے والے اخبارات اور رسایل کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے جگہوں سے شایع ہونے والے رسایل میں برابر شایع ہوتا تھا۔

طالب نے شعر گوئی کا آغاز بارہ سال کی عمر سے کیا تھا۔ ان کا پہلا شعر یہ تھا۔

کیا وہ نہ آئیں بیٹھو بھی ہے جذب دل وہ چیز
محمل سے لیلیٰ ناقہ سے محمل اتار دیں۔

اس شعر کو اس وقت کے اہم شاعر مولوی امیر الدین امیر نے سن کر بڑی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس کے بعد طالب نے باقاعدہ طور پر شاعری کا آغاز کیا۔ شروع میں وہ دربار لکھنو کے مدیر منشی رام سہائے تمنا سے اکتساب فیض کرتے رہے اور ان کے پرچے میں ان کا کلام شایع ہوتا رہا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک مولانا سید احمد حسن شوکت میرٹھی' سے اصلاح لینے لگے۔ لیکن مولانا نے اصلاح کے بجائے کلام کاٹ چھانٹ کر واپس کر دیا۔ جس سے دونوں میں جھگڑا ہوا اور برسوں تک "اخبار عام" کے کالموں میں بحث و مباحثے کا ایک دفتر کھل گیا۔

۱۹۱۵ء میں حضرت برجموہن دتاتریہ کیفی کے ساتھ راہ و رسم پیدا ہوئی جو اس زمانہ میں نواب صاحب کنجپورہ کے دیوان تھے۔

طالب باضابطہ طور پر حضرت کیفی کے حلقۂ قلمند میں شامل ہو گئے۔ جس سے ان کا رنگ سخن نکھر گیا اور زبان و بیان کے برتاؤ میں پختگی پیدا ہو گئی خود کہتے ہیں:۔

حضرت کیفی کی شاگردی پر نازاں کیوں نہ ہوں
میں ہوا طالب تو بخشا فیض روحانی مجھے

علامہ کے ساتھ طالب کا تعلقِ خاطر برسوں رہا۔ شروع میں وہ اپنا کلام ڈاک سے اپنے استاد کو بھیجا کرتے تھے بعد میں جب کیفی صاحب ریاست جموں و کشمیر کی سرکار میں اسسٹنٹ فارن سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوئے تو خود اُن کی خدمت میں حاضر ہوکر شعر و سخن کے رموز سیکھے۔

طالب نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا تھا۔ کافی عرصہ تک وہ غزل کہتے رہے بعد کے برسوں میں وہ نظمیہ شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُن کی غزلیہ شاعری کا بیشتر حصہ اُن کے شعری مجموعے رشحات التخیل میں شامل ہے۔ بعد میں انہوں نے جب نظموں کی طرف توجہ کی اور رباعیات بھی کہیں تو انہیں اپنے دوسرے مجموعے کلام مرقعِ افکار میں شامل کیا۔ ان کے دونوں مجموعے رشحات التخیل ۱۹۲۵ء اور مرقع افکار ۱۹۵۲ میں بالترتیب شایع ہوئے۔ طالب محض گل و بلبل کے شاعر نہیں تھے۔ وہ زبان اور محاورے کو ہی اعلیٰ شاعری کا معیار نہیں سمجھتے تھے بلکہ حسن کلام کے ساتھ شعر میں تاثیر کے بھی قایل تھے۔ وہ کشمیر کے پہلے شاعر تھے جن کا مجموعہ کلام شایع ہوا اور جسے اردو کے ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اردو کے روایتی مرکزوں سے دور کشمیر جیسے دور افتادہ خطے سے تعلق رکھنے کے باوجود انہیں زبان و بیان پر جو قدرت حاصل تھی، اس کا اعتراف اردو کے بڑے بڑے صاحبانِ نظر نے کیا ہے۔ وہ یقیناً اردو زبان کے بہت بڑے خدمت گزار اور معمار تھے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ان کے کلام کے مطالعے کے بعد رشحات التخیل پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے۔

"مجھے فی الحقیقت تعجب ہے کہ آپ نے
وادیٔ کشمیر میں رہ کر اردو زبان میں ایسی قدرت
کیونکر حاصل کر لی۔ یہ آپ کی ذہانت اور فراست

کی دلیل ہے اور اس پر آپ کی نظر، آپ کا بیان
قابلِ داد ہے۔ بیان میں صفائی اور گداز ہے"

طالب کی غزلیں ہوں یا نظمیں ان میں کہیں پر بھی سوقیت اور ابتذال نہیں پایا جاتا۔ خیال کی وسعت، بیان کی متانت اور زبان کی برجستگی ان کے کلام کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ ان کی نظموں کے موضوعات متنوع ہیں۔ انہوں نے نیچرل، قومی، سیاسی سماجی، مذہبی ہر طرح کے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے کلام کی خصوصیات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے علامہ کیفی نے ایک جگہ پر لکھا ہے۔

"طالب کے کلام میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر طرز میں اپنا رنگ جما جاتے ہیں۔ اپنے وقت پر یقیناً صاحب طرز مانے جائیں گے۔ احساسات قلبی کی تصویر کھینچنے میں ان کو درجہ کمال حاصل ہے۔ یہی حال حقایق نگاری کا ہے۔ زبان کی درستی اور محاورے کی صحت اس درجہ کی ہے کہ ایک اہل زبان کے کلام میں اور طالب کے کلام میں فرق کرنا مشکل ہے۔"

طالب کے کلام میں فارسی شاعری کا بھی قابل قدر سرمایہ موجود ہے انہوں نے فارسی میں نظموں اور غزلوں کے علاوہ کئی اساتذۂ فارسی کی تضمینیں، قطعات اور تاریخیں بھی لکھی ہیں۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ع طالب دلبر رہے تو کیا خطا کرتے رہے — عمر بھر یہ ایک حق تھا جو ادا کرتے رہے
ع مانند بوئے گل اڑے طالب جہاں سے — ایسے گئے کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا
ع ہو گئے جب ہم اسی کے وہ ہمارا ہو گیا — راز یک رنگئ الفت آشکارا ہو گیا

| | |
|---|---|
| ؎ اگر صادق ہو سوزِ عشق ملنا کیا حقیقت ہے | حرارت ہو اگر کامل تو لوہا بھی پگھلتا ہے |
| ؎ عجب ہے شاہراہِ عشق پر آشوب اے دلبر | کہ جو رکھتا قدم اس راہ میں وہ پھسلتا ہے |
| ؎ مہمان ان کا ہوگیا کیا بِن بلائے دل | اُٹھنے کی جب میں ٹھان لوں تو پھر بٹھائے دل |
| ؎ اس طرح کون ہے جو جلائے بجھائے دِل | یارب کسی بشر پہ کسی کا نہ آئے دِل |
| ؎ بچپن کا ایک رفیق تھا اب وہ بھی پھٹ گیا | دل میرا آشنا ہے نہ میں آشنائے دِل |

طالب تنقید و تحقیق سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ اپنے دونوں شعری مجموعوں پر ان کے خود لکھے ہوئے دیباچے، بہارِ گلشن کشمیر پر ان کا تبصرہ، اور سب سے بڑھ کر کلام غالب پر جایزہ، کلام غالب کے عنوان سے ان کا تبصرہ ان کے جودتِ ذہن اور تنقیدی صلاحیت پر دلالت کرتا ہے۔ وہ زمانے کے تقاضے کے مطابق ادب میں انقلاب کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور اس کا اظہار وہ اپنی تحریروں میں کرتے ہیں۔ ان کے آخری کارناموں میں کشمیر کی مشہور عارفہ اور شاعرہ لل دید کے واکھیوں کا منظوم ترجمہ اور جائزہ کلام غالب جس کا ذکر ابھی ہوا قابلِ ذکر ہیں۔ لل دید کے کلام کا ترجمہ انہوں نے پروفیسر جیالال کول کے ساتھ مل کر کیا تھا۔ اس کی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

طالب اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ وہ اردو شاعری کے توسط سے کشمیر کے شاعرانہ ذہن اور کشمیریوں کی اردو دانی کی شناخت کروانے والے پہلے بلند مرتبت شاعر تھے۔ جن کا کلام بلا عتت نظام سارے ملک کے اردو دان طبقے میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اور جنہوں نے اس حقیقت کو منوالیا تھا کہ کشمیری ذہن اردو کے بڑے بڑے مراکز سے تعلق رکھنے کے باوجود اس زبان میں بھی اپنے جودتِ ذہن اور فکرِ بلیغ کا جادو جگا سکتا ہے۔

## کشپ بندھو (۱۹۰۰ — ۱۹۸۵)

کشپ بندھو کا خاندانی نام تارا چند تھا۔ ایک زمانے میں شعر کہا کرتے تھے اور بلبل تخلص کرتے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں گیرو ترال (اب نور پورہ) میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم ا اپنے آبائی گاؤں گیرو میں پائی تھی۔ ۱۹ سال کی عمر میں انٹرنس کامیاب کیا تھا۔ اسی سال محکمہ بندوبست میں شجرہ کش کے عہدے پر تعینات ہوئے۔ لیکن یہ ملازمت راس نہ آئی اس لئے اپنے وطن سے بھاگ کر لاہور میں پناہ لی اور ایک کوئلے کی دکان میں کام سنبھالا۔ طبیعت میں سیمابی کیفیت تھی۔ یہاں سے بھی بھاگ کر کوئٹہ (بلوچستان) پہنچے اور محکمہ ٹیلیگراف میں کلرک بھرتی ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس کی سول نافرمانی تحریک نے پورے ملک میں آگ لگا دی تھی۔ لوگ مہاتما گاندھی کی اپیل پر سرکاری ملازمتوں سے دھڑا دھڑ مستعفی ہو رہے تھے۔ تارا چند نے سیاست کا پہلا درس یہیں حاصل کیا اور انہوں نے بھی قومی جذبات سے سرشار ہو کر سرکاری نوکری پر لات ماری۔ اس کے بعد چار برس تک برہمہ ودھیالیہ میں زیر تعلیم رہے۔

ذکر ہو چکا ہے کہ بندھو جی مہاتما گاندھی کی تحریک سول نافرمانی سے متاثر تھے اور آزادیٔ وطن کی چنگاری ان کے دل میں بھڑک اٹھی تھی۔ پنجاب کے مختلف شہروں میں گھوم کر انہیں کشمیری مزدوروں کی ناداری اور کسمپرسی کی حالت کا احساس ہوا تھا۔ یہیں "کشمیریت" کے جذبے نے بیدار ہو کر شدت اختیار کر لی۔ چنانچہ لاہور میں ہی ایک مزدور بورڈ کا قیام عمل میں لایا۔ جس کا مقصد کشمیری مزدوروں کے مفادات کا تحفظ کرنا تھا۔ بندھو جی سیکرٹری کی حیثیت سے کافی عرصہ تک اس بورڈ کی عنان سنبھالے رہے۔ لاہور میں مقیم کشمیری پنڈت اور کشمیری مسلمان اس بورڈ سے [illegible] علامہ اقبال بھی اس بورڈ کے

بھی خوابوں میں تھے۔ ۱۹۲۹ء میں اس بورڈ کا عظیم الشان جلسہ لدھیانہ میں ہوا تھا۔
جہاں پنڈت موتی لال نہرو نے زبردست تقریر کی تھی۔ اس پلیٹ فارم پر
پہلی بار مطالبہ ہوا تھا کہ کشمیر کشمیریوں کے لئے ہونا چاہیئے۔ ملکی اور وطنی جذبات
سے سرشار تاراچند نے اسی زمانہ میں کشپ بندھو کا نام اختیار کیا تھا اور اسی
نام سے وہ مشہور ہوئے۔

بندھو جی ۱۹۳۱ء میں کشمیر لوٹ آئے اور کشمیری پنڈتوں کو منظم کرنے کے لئے
"سناتن دھرم یووک سبھا" کی بنیاد ڈالی اور پریم ناتھ بزاز کے "وتستا" کے بعد پہلا
روزنامہ "مارتنڈ" جاری کیا۔ کئی سال گزرنے کے بعد جب شیخ محمد عبداللہ کی
قیادت میں نیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا تو یووک سبھا سے مستعفی ہو کر نیشنل
کانفرنس میں شامل ہوئے اور باضابطہ طور پر عملی سیاست میں کود پڑے۔ تحریک
آزادی کی جدوجہد کے دوران وہ تقریباً دس برس تک قید رہے۔ سب سے
پہلے لاہور میں "نوجوان سبھا" کے ساتھ وابستگی کی بنیاد پر سانڈرس کے قتل
کے سلسلے میں گرفتار ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں شیخ صاحب کی سربراہی میں جب عوامی
حکومت قائم ہوئی تو بندھو جی کو دیہاتوں سے متعلق محکمہ جات کا ڈائریکٹر جنرل مقرر
کیا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں جب شیخ وزارت معزول ہوئی تو بندھو جی بھی ملازمت سے
برطرف کئے گئے اور انہیں از سر نو گرفتار کیا گیا۔ ان کی آخری گرفتاری ۱۹۵۸ء
میں عمل میں لائی گئی اور ۱۹۶۰ء میں رہا کیا گیا۔

کشپ بندھو ریاست کے ان معدودے چند صحافیوں میں سے ایک ہیں۔
جنہوں نے اس ریاست میں صحافت کا چراغ روشن کیا۔ اور اسے ایک نئی سمت دی۔
لاہور کے قیام کے دوران ان پر جب کشمیریوں کی مظلومیت آشکار ہوئی تھی، تب
ہی کشمیریوں کے تشخص کے لئے انہوں نے غور و فکر کرنا شروع کیا تھا۔ تاراچند

سے کشپ بندھو کا نام اختیار کرنا اسی جذبے کا ردِ عمل تھا۔ کشپ بندھو۔ کشپ ریشی کا بیٹا۔ یہ خالص کشمیریت کا جذبہ تھا اسی جذبے کے زیرِ اثر انہوں نے کشمیری مزدوروں کے بورڈ کی تشکیل کی تھی اور اپنے قلم کی جولانیوں کو بروئے کار لایا۔ بیسویں صدی کے دوسرے دہے تک ریاست میں پریس کی کوئی آزادی نہیں تھی۔ اس لیے کوئی اخبار بھی شایع نہیں ہوتا تھا۔ کشپ بندھو نے لاہور کے مختلف پرچوں میں نظم اور نثر کے ذریعے اپنے اظہار کو زبان بخشی۔ اس کے بعد وہ اخبار عام' اخبار کشمیر' بہار کشمیر کے کشمیری سیکشن کو ایڈیٹ کرتے رہے اور ساتھ ہی آریہ گزٹ کے مدیر بھی رہے۔

کشمیر لوٹ آنے کے بعد بندھو جی نے جہاں عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ وہاں اپنے قلم کے جوہر بھی دکھائے۔ آل سٹیٹ کشمیری پنڈتس یووک سبھا کی تشکیل کے بعد بندھو جی نے چند سر برآوردہ لوگوں کے اشتراک سے اخبار "مارتنڈ" کا اجرا کیا۔ یہ کشمیر کا پہلا روزنامہ تھا۔ برس ہا برس تک یہ اخبار بندھو جی کی ادارت اور نگرانی میں شایع ہوتا رہا۔ یووک سبھا سے علیحدہ ہونے کے بعد کشپ بندھو نے اپنا اخبار "کیسری" جاری کیا اور اس میں وہی رنگ و آہنگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جو لوکمانیہ تلک نے اپنے اخبار "کیسری" میں تحریک آزادی کے دوران پیدا کیا تھا۔ اس اخبار میں بندھو جی نے اپنے شعلہ بار قلم کی توانائیاں ثابت کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس اخبار کی اشاعت سرکار نے روک دی۔ اس کے بعد انہوں نے "دیش" کے نام سے ایک اور ہفت روزہ جاری کیا۔ یہ اخبار برسوں تک کشمیری عوام کی آواز ثابت ہوا۔

کشپ بندھو اپنی جوانی میں نہ صرف تقریر کے غازی تھے۔ بلکہ ان کے پاس ایک ظرافت ور قلم تھا۔ اخباروں کے اداریوں کے علاوہ وہ فکاہیہ' مزاحیہ اور سنجیدہ مضامین بھی لکھتے تھے۔ ان کے مزاح میں طنز کے تیکھے نشتر چھپے ہوتے تھے اور تحریر انتہائی شگفتہ۔ اس لیے انہیں ایک زمانے میں "کشمیر کا لطرس" کہا جاتا تھا۔ وہ علامہ مجہول کے

فرضی نام سے مارتنڈ میں "چلنت" کے عنوان سے ایک مستقل کالم لکھا کرتے تھے جسے قدر اور تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اخبار بین حضرات ہر دوسرے شمارے کا بے تابی سے انتظار کرتے تھے۔ ایک زمانے میں وہ کشمیری میں شعر بھی کہتے تھے۔ بعد میں اردو میں شاعری کرنے لگے۔ وہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی اور طالب کاشمیری سے اصلاح لیتے تھے۔ نثر میں ان کا ذوقِ سلیم ان کی رہنمائی کرتا تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں

میری تقدیر بھی الٹی میری تدبیر بھی الٹی
کسی محبوب کی ترچھی نگاہیں یاد آتی ہیں

ہوئی ہیں راہیٔ ملکِ عدم میری تمنائیں
مجھے ان بے کسوں کی خواب گاہیں یاد آتی ہیں

نغموں سے بولتا ہوں دنیا کے رنج و غم میں
اے بلبلِ خوش الحان، پھر نغمہ یار بن جا

تارا چند بلبل کو آج کوئی نہیں جانتا کہ جس کے سینے میں ایک شاعر اور ایک ادیب کا دل تھا۔ اگر وہ سیاست کے راستے پر گامزن نہیں ہوتے تو یقیناً ہمارے ادب میں ایک بڑے قلم کی جولانیوں سے ایک نئے رنگ کا اضافہ ہوتا۔ لیکن یہ بھی کیا کم ہے کہ انہوں نے ہماری صحافت کو ایک سمت عطا کی اور جدوجہد آزادی میں ایک شاندار رول ادا کیا۔ بندھو جی نے برسوں پہلے کہا تھا

بلبل، نہ یہ وصیت احباب بھول جائیں
گنگا کے بدلے میرے جہلم میں پھول جائیں

تارا چند بلبل المعروف کشپ بندھو کی یہ وصیت ان کے دل کی گہرائیوں سے پھوٹی ہوئی والہانہ خواہش تھی اور اس بات پر دال ہے کہ انہیں کشمیر کی مٹی سے کس قدر پیار تھا اور وہ گنگا کے تقدس پر وتستا کے تقدس کو ترجیح دیتے تھے۔ یہی ان کی عظمت تھی۔

## رسا جاودانی (۱۹۰۱ ـ ۱۹۷۹ء)

رسا جاودانی کا اصلی نام عبدالقدوس ہے۔ وہ ۱۹۰۱ء میں بھدرواہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ سکھوں کے عہدِ حکومت میں اننت ناگ کشمیر سے ہجرت کر کے بغرضِ تجارت یہاں آئے تھے اور یہیں پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کے والد خواجہ منور تجارت پیشہ تھے اور فارسی علم وادب سے شغف رکھتے تھے۔ رسا نے ابتدائی تعلیم انہی سے حاصل کر لی بعد میں ذاتی مطالعے سے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا۔ انگریزی تعلیم گھر پر حاصل کی اور مدرسی کا پیشہ اختیار کیا۔ برسوں تک وہ اردو اور فارسی پڑھاتے رہے۔

رسا کو گھر میں علمی ماحول ملا تھا۔ اسلئے بچپن سے ہی شعر و شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ شعر کہنے کے ساتھ ساتھ انہیں گانے بجانے سے بھی دلچسپی تھی۔ جس نے ان کے تخلیقی صلاحیت کو دو آتشہ بنا دیا۔ ان کے دل میں گانے اور بجانے سے عجیب گداختگی پیدا ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ شعر گوئی میں خاصی دسترس حاصل کی۔

رسا نے ہمیشہ اپنے ذوقِ رسا کو اپنا رہنما بنایا اور اپنی خداداد صلاحیت کے سہارے ان کے کلام میں اس قدر پختگی پیدا ہوئی کہ ریاست کے بڑے شعراء میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ان کے دو شعری مجموعے لالۂ صحرا (۱۹۴۸ء) نظم ثریا (۱۹۶۲ء) میں شایع ہو چکے ہیں۔ یہ دونوں مجموعے اردو دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ رسا نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں نظم، غزل، قطعات، رباعیات، گیت، مسدس، وغیرہ ملتے ہیں۔ ان کے کلام پر اردو کے اساتذہ کا رنگ ملتا ہے۔ لیکن رسا نے کمالِ فنکاری سے اسے اپنے کلام میں آمیز کیا ہے۔ بنیادی طور پر وہ روایت پسند ہیں لیکن بعض غزلیں انہوں نے نئے انداز اور نئے اسلوب میں کہی ہیں۔ اگرچہ رسا کے کلام میں مجموعی طور پر ان کے جودتِ ذہن کا اندازہ

ہوتا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں اور اسی صنف میں ان کا جوہر نمایاں ہوتا ہے۔ انہوں نے بیشتر غزلوں میں چھوٹی بحور کا استعمال کیا ہے۔ جن میں موضوع کے اعتبار سے فکر اور سوچ کی گہرائیاں نظر آتی ہے۔ رسا کی غزلوں میں تحزن وملال کی ایک خاص کیفیت کا احساس ہوتا ہے لیکن وہ اس ملال کو اپنی شاعری پر حاوی ہونے نہیں دیتے۔ اُن کے اشعار میں ایک ہلکی ہلکی سلگتی ہوئی آگ کا احساس ہوتا ہے۔ جس کا اثر اُن کے قاری کو تڑپا دیتا ہے۔ رسا کے یہاں غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم دوراں کے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ اُن کے کلام کے مطالعے سے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ محض اپنی بیتی نہیں سناتے بلکہ ایک وسیع تناظر میں جگ بیتی کا احساس دلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں موضوعات کی بوقلمونی ملتی ہے۔ وہ حسن وعشق کے علاوہ مناظر فطرت، فطرت انسانی اور حب الوطنی کے موضوعات کو بھی برتتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

ہے غنیمت اگر میسر ہو — ایک لمحہ بھی شادمانی کا

ستارو رات بیتی جا رہی ہے — وہ میرا مست خواب آئے نہ آئے

میری شاعری میری ساحری ہے خیال الفت سے بھری
نہیں یہ رجز کی فسوں گری مگر آتشی کلام ہے

خضر مجھ سے ملیں تو میں پوچھوں — مدعا عمر جاودانی کا

رسا جاودانی نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ یہ نظمیں محض روایتی نظمیں نہیں ہیں ان میں مناظر قدرت اور فطرت انسانی کے جذبات خوبصورتی سے پیش کئے گئے ہیں۔ منظر نگاری میں رسا خاص قدرت رکھتے ہیں۔ وہ الفاظ کے مناسب استعمال سے معنی کی نئی جہتیں اُبھار کر پورے منظر کو ایک مصور کی تصویر بنا دیتے ہیں۔ ایسے مناظر غیر محسوس طریقے سے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی بعض غزلوں میں بھی نظم کا سا تسلسل پایا جاتا ہے۔

اگرچہ رسا بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے اور اردو کے ناقدین نے جن میں پروفیسر زور بھی شامل ہیں ان کی غزل گوئی کو ان کی نظمیہ شاعری پر اولیت کا درجہ دیا ہے لیکن نظر غائر سے دیکھا جائے تو نظم گوئی میں بھی اُن کا درجہ کچھ کم نہیں ہے۔ انہوں نے نظمیں بھی اُسی خونِ جگر کی آمیزش سے کہی ہیں جو ان کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ رسا کی نظموں میں ہیئتی اعتبار سے بھی تنوع ملتا ہے اور موضوع کے اعتبار سے بھی۔ انہوں نے نظم کو کئی اسالیب دیئے اور ساتھ ہی مختلف موضوعات ان میں برتے۔ اُن کی نظموں کا امتیاز فطرت انسانی کی عکاسی ہے۔ انہوں نے مناظر قدرت کی تصویر کشی کو بڑی سحر انگیزی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی کے خوبصورت الفاظ کو برت کر اپنی نظموں میں ایک نیا آہنگ پیدا کرتے ہیں۔ اُن کی نظمیں اپنی رنگا رنگی اور تازہ کاری سے ان کی غزلوں کے حُسن سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔

رسا جاودانی کشمیر میں اردو شاعری کے ایک اہم معمار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کی قادر الکلامی اُن کو اردو کے ایسے باکمالوں کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے جنہوں نے ریاست میں اردو کی ترویج اور بقا کے لئے قابل قدر کام کیا اور ریاست کو اردو کا ایک اہم مرکز بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ حالانکہ انہوں نے ناداری اور افلاس کے دن دیکھے تھے اور اُن کے پاس اُن کے زمانے میں وسائل محدود ہونے کے باعث بے پناہ دشواریاں سدراہ تھیں۔

حارثہ سرکام

## عبدالاحد آزاد (۱۹۰۳ء - ۱۹۴۸ء)

عبدالاحد آزاد ۱۹۰۳ء کو رانگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خواجہ سلطان ڈار ایک صوفی منش انسان اور مذہب پرست بزرگ تھے

وہ عربی اور فارسی پر اچھی دسترس رکھتے تھے۔ چنانچہ آزاد نے ابتدائی تعلیم اُن ہی سے حاصل کی۔ منشی عالم کا امتحان امتیاز سے کامیاب کیا۔ اور تیرہ روپیہ ماہوار پر مدرس ہوگئے اس پیشے سے عمر بھر مشغول رہنے کے بعد ۱۹۴۸ء میں انتقال کر گئے۔

آزاد بچپن سے ہی شعر و ادب کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے اگرچہ اُردو میں بھی شعر کہے ہیں لیکن کشمیری شاعری سے انہوں نے اپنی پہچان منوائی۔

تحقیق و تنقید کے شعبے میں عبدالاحد آزاد نے بڑی سنجیدگی سے قلم اُٹھایا۔ انہوں نے ۱۹۳۵ء میں "حیات مہجور" کے عنوان سے ایک مختصر سا مقالہ لکھنا شروع کیا تھا لیکن ذوق جستجو نے اس کام کو کافی پھیلا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کافی ضخیم مسودہ تیار ہو گیا۔ یہ مقالہ اگرچہ ۱۹۴۷ء سے قبل لکھا گیا تھا۔ لیکن شائع نہ ہو سکا۔ ۱۹۵۹ء میں پہلی بار ریاستی کلچرل اکادمی کے اہتمام سے یہ مسودہ کشمیری زبان اور شاعری کے عنوان سے تین جلدوں میں شائع ہوا۔ آزاد زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن ان کی کھوج اور تحقیق کے جذبے کو دیکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک بڑے محقق تھے اور گہری تنقیدی بصیرت کے مالک تھے اس زمانہ میں جب کشمیر میں رسل و رسائل کے موزوں ذرائع بھی موجود نہ تھے۔ آزاد مہینوں پاپیادہ دور دراز دیہاتوں میں گھومتے رہے اور بڑی جگر کاوی سے اپنا مواد اکٹھا کیا۔ کشمیری زبان کے شعراء کے اس پہلے قابل قدر اور معتبر تذکرے میں لل دید سے لیکر مہجور کے عہد تک بیشتر شعراء کا ذکر کیا گیا ہے

اتنا ہی نہیں کہ آزاد نے صرف چند نام گنوانے پر اکتفا کیا ہو بلکہ مشہور اور معروف شعراء کا بھی ذکر کیا ہے اور اُن کے بارے میں مواد فراہم کر کے ان پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ آزاد کی بے پایاں محنت اور لگن اور ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کتاب کے مقدمے میں علی جواد زیدی رقمطراز ہیں :-

"آزاد کی نظر میں وسعت ہے انہیں تحقیق کرنے والوں کی ہمت اور صبر ہے۔ ان کے قلم میں روانی اور سلاست ہے اور وہ ایک بڑے کام کے انجام دینے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں کسی مشعل کے بغیر یہ تاریکیوں میں رواں چلے جاتے ہیں صدیوں کے پردے چاک کرتے ہیں اور کم از کم چھ صدیوں پر پھیلے ہوئے مواد کو تین مختصر جلدوں میں یکجا کر دیتے ہیں۔ یہ بجائے خود ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے"

کشمیری زبان اور شاعری جس کے لیے آزاد نے تاریخ ادبیات کشمیر کا نام تجویز کیا تھا۔ کشمیری زبان کی شاعری کی تاریخ ہے لیکن اسے اردو ادب میں ایک قابل قدر محققانہ تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے۔ آزاد پہلے محقق اور ناقد ہیں جنہوں نے اردو زبان میں اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے تاریخی اور سماجی پس منظر سے مدد لے کر نتائج اخذ کئے ہیں اور نہ صرف اس زبان کی تدریجی ارتقاء پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے بلکہ مختلف ادوار کے شعراء کے حالات بیان کر کے اپنی پوری تنقیدی بصیرت کے

ساتھ ان کے کلام کو پرکھا ہے آزاد کو محض ایک تذکرہ نویس قرار دینا حقیقت سے انحراف کرنا ہے۔ اس سے ان کے کارنامے کی اہمیت گھٹ جاتی ہے

آزاد ایک وسیع نظریئے کے حامی نظر آتے ہیں خود لکھتے ہیں:۔

"ہر انقلاب پرانے تہذیب و تمدن کو نئے سانچے میں
ڈھالتا ہے ادب بھی انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ
اس کی ہر منزل پر نئے نئے روپ بدلتا ہے مگر
ہر نئے ادب کو پرانے ادب کے ساتھ گہرا ربط
ہوتا ہے"

اس طرح آزاد پر بدلتے ہوئے عہد کے ڈانڈے ماضی اور روایات کے ساتھ ملاتے ہیں اور یہی ان کے سیاسی نقطہ نظر کا غماز ہے۔ آزاد نے عملی تنقید کے چند اچھے نمونے بھی پیش کئے ہیں اور ساتھ ہی اس پچھڑی ہوئی زبان کے قابل قدر سرمائے کو اردو قارئین تک پہنچانے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ ان کا یہ احساس قومیت کے زبردست جذبے پر استوار ہے ایک معمولی تعلیم یافتہ پرائمری سکول معلم کے تبحر علمی اور گہری نظر کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ مغربی تنقید سے واقف نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی گہرا تنقیدی ادراک رکھتے ہیں۔ نفسیاتی تحلیل "ادب برائے ادب"، "ادب برائے حیات"، اجتماعی اور ادب اور زندگی کے رشتے کی وضاحت کرتے ہیں اور اپنی کتاب کے آغاز میں ان تمام انگریزی کتابوں کی فہرست مرتب کرتے ہیں جن میں کشمیری زبان پر غیر ملکی مصنفین نے قلم اٹھایا ہے۔ ابتدائی حصول میں تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ لیکن کتاب کی تیسری جلد

میں آزاد نے ایک اچھا اور متوازن ناقد ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ غرض آزاد کی کتاب تحقیق اور تنقید کا قابل قدر کارنامہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

## پریم ناتھ بزاز (۱۹۰۵ء — ۱۹۸۴ء)

پریم ناتھ بزاز ۱۳ جولائی ۱۹۰۵ء کو سری نگر کے ایک کھاتے پیتے کشمیری پنڈت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی درسیات حسب روایت مکتب میں پائی۔ باغ دلاور خان کے سٹیٹ ہائی سکول سے ۱۹۲۲ء میں میٹریکولیشن کا امتحان درجہ اول میں امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ ۱۹۲۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ کچھ عرصہ پبلک ورکس محکمے میں کلرک کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد کشمیری پنڈتوں کے ویمنز ویلفیئر ٹرسٹ ادارے کے زیر اہتمام چلنے والے زنانہ سکولوں کے انسپکٹر ہو گئے اس عہدے سے سبکدوش ہو کر عملی سیاست میں کود پڑے کچھ عرصہ یووک سبھا کے صدر رہے۔ ۱۹۳۱ء میں آئینی اصلاحات اور ازالۂ شکایات کمیشن (گلانسی کمیشن) میں کشمیری پنڈتوں کے مفادات کی ترجمانی کے لیے نامزد ہوئے لیکن کمیشن کی رپورٹ کشمیری پنڈتوں کیلئے ہتک آمیز تھی۔ اس لیے بزاز کو طنز و تضحیک کا سامنا کرنا پڑا۔ ان پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں انہوں نے سرینگر سے پہلا روزنامہ "وتستا" جاری کیا۔ اور صحافت کا دروازہ کھول دیا۔ اسی سال ان کی ملاقات شیخ محمد عبداللہ سے ہوئی اور اُن کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے شیخ صاحب کے ساتھ مل کر ہفت روزہ "ہمدرد"

نکالا اور دونوں رہنما آزادی، سیکولرازم اور جمہوریت کے کاز کیلئے سرگرم عمل ہوئے۔ حالانکہ ابھی نیشنل کانفرنس معرض وجود میں نہیں آچکی تھی۔ بزاز مسلم کانفرنس کے اس تاریخ ساز جلسے میں شریک ہوئے جسے نیشنل کانفرنس میں منتقل کیا گیا۔ وہ برسوں تک نیشنل کانفرنس کی مجلس عاملہ کے سرکردہ ممبر رہے۔ ۱۹۴۰ء میں شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ ان کے سیاسی اختلافات کا آغاز ہوا۔ اور نیشنل کانفرنس کی رکنیت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں ایم این۔ رائے کے ریڈیکل ڈیموکریٹک نظریئے سے متاثر ہوئے اور اس کے زیر اثر انہوں نے کشمیر سوشلسٹ لیگ کی بنیاد ڈالی۔ ان کے سیاسی نظریات نے اور لوگوں کے علاوہ کئی حساس تخلیق کاروں کو اپنی مقناطیسی گرفت میں لے لیا۔ ان میں خاص طور پر کشمیری زبان کے مشہور شاعر عبدالاحد آزاد اور ہندوستان گیر شہرت کے مالک افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی بھی تھے۔ ۱۹۴۷ء میں بزاز پر ایک بار پھر قاتلانہ حملہ ہوا۔ ان کے اخبار "ہمدرد" کی اشاعت پر پابندی عائد کی گئی۔

"حق خود اختیاری" کا موقف اپنا کر بزاز نے اپنوں اور بیگانوں کی تضحیک کو دعوت دی۔ انہیں قید و بند کے مرحلوں میں سے گزرنا پڑا اور ۱۹۵۰ء میں انہیں ریاست بدر کر دیا گیا اس کے بعد بزاز صاحب نے دہلی کو اپنا مستقر بنا لیا۔ ریاست سے باہر رہنے پر بھی وہ اپنے سیاسی موقف اور سرگرمیوں سے پیچھے نہیں ہٹے اور انہیں کئی بار جیل جانا پڑا۔ ۱۹۵۵ء میں انڈین ریشنل ایسوسی ایشن کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ اس

دوران وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کے باوصف اپنے قلم کا جوہر آزماتے رہے اور انہوں نے کئی معرکتہ آرا کتابیں تصنیف کیں ان کا بنیادی موضوع کشمیر رہا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں ریاستی کلچرل اکادمی نے ان کی ادبی اور تحقیقی خدمات کے اعتراف میں انہیں خلعت شب سے نوازا۔

پنڈت بزاز نے بہت ہی کم سنی کے زمانے سے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان کے ابتدائی مضامین ۱۹۲۲ء سے لاہور کے اخبار عام میں شایع ہوتے تھے۔ اس کے بعد وہ برس بابرس تک صبح کشمیر لاہور، اخبار عام لاہور، رنبیر جموں وغیرہ کے لئے لکھتے رہے۔ ان کی سیاسی زندگی سے قطع نظر بزاز صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ڈوگرہ شاہی کے تاریک زمانے میں کشمیر سے پہلا اردو اخبار ولستا جاری کیا۔ اس اخبار کے توسط سے نہ صرف کشمیر میں صحافت کی راہیں کھل گئیں۔ بلکہ کشمیریوں کو ریاست کے اندر اور باہر ہزاروں لوگوں تک اپنی آواز پہنچانے کا موقعہ ملا۔ یہ کام بڑے دل گردے کا کام تھا۔ ۱۹۳۵ء میں شیر کشمیر کے ساتھ مل کر انہوں نے ہمدرد جاری کیا۔ جو کشمیر کا حقیقی ترجمان بن گیا۔ کچھ عرصہ تک مولوی عبدالرحیم کے اخبار ہفت روزہ صداقت کے پس پشت بھی کام کرتے رہے۔ اور اپنی تحریروں سے اس اخبار میں جان ڈال دی۔ ہمدرد نے ۱۹۳۸ء میں ذمہ دار نظام حکومت کا دستاویزی نمبر شایع کیا۔ اس سے سرکار کے ایوانوں میں ہلچل مچی اور اس کو ضبط کیا گیا یہ اخبار ۱۹۴۷ء تک آب و تاب کے ساتھ شایع ہوتا رہا۔ دہلی کے قیام کے دوران بزاز صاحب نے "وائس آف کشمیر" کے نام سے

ایک انگریزی ماہانہ جاری کیا۔

بزاز صاحب تحریک آزادی کے اولین دور میں صف اول کے قائدین میں سے تھے وہ اپنے عہد کے ایک سربرآوردہ صحافی اور ادیب تھے۔ انہیں اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ اپنی سیاسی اور صحافتی مصروفیات کے باوجود وہ دونوں زبانوں کے توسط سے دوسرے کارنامے انجام دیتے رہے۔ اُردو تصانیف میں کشمیر کا گاندھی، شاعر النانیت (عبدالاحد آزاد کی سوانح حیات) گاندھی ازم، جناح ازم اور سوشلزم اور انگریزی میں وتستا کی بیٹیاں، اندرون کشمیر تحریک آزادی کی تواریخ، آزاد کشمیر، ہندوستانی تواریخ میں بھگوت گیتا کا حصہ وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

پریم ناتھ بزاز کی بڑی کمزوری کشمیر تھا۔ انہیں یہاں کے رسوم رواج سے محبت تھی۔ یہاں کی سیاست ثقافت، تاریخ، شاعری، ادب سے عشق تھا۔ ان کی تحریریں اس کا کھلا اور واضح ثبوت ہیں۔ وہ ایک آزاد خیال اور خطرناک حد تک بے باک دانشور تھے اپنے آدرشوں اور اصولوں کا تحفظ انہوں نے زندگی بھر ٹھسے سے کیا۔ اس کے لیے انہوں نے بڑی قربانیاں دیں۔ وہ جھکنا نہیں جانتے تھے۔ وہ چاہتے تو اپنا راستہ موڑ کر مقابلتاً ایک آرام دہ زندگی بسر کر سکتے تھے لیکن ایسے آدمی دوسری مٹی کے بنے ہوتے ہیں۔ وہ جسمانی اور مادی آسائشوں کے لیے اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرتے۔ بزاز کا سیاسی موقف اور ان کے سیاسی نظریات ہندوستان اور کشمیر کی سیاسی لیڈرشپ کے اس حصے سے آزادی سے کچھ عرصہ پہلے متصادم ہوا جن کے ساتھ انہوں نے شانہ بشانہ کام کیا تھا اور ایک متحدہ

ہندوستان کا خواب دیکھا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بٹوارے نے اس اختلاف کو تیز تر کیا۔ انہوں نے اپنے لیے ایک انتہا پسند، کٹھن اور خطرناک راستہ منتخب کیا اور وہ اپنے عزیز دل، دوستوں اور رفیقوں سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ ان کے ہم نوا تعداد میں بہت کم تھے لیکن وہ جس مٹی کے بنے ہوئے تھے اس میں سمجھوتے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ انہیں اپنی تنہائی کا کوئی غم نہیں تھا اور نہ ان نتائج کی پروا تھی جو غارت گر ہو سکتے تھے۔ وہ آخر تک سمجھتے رہے کہ ان کا موقف صحیح ہے۔ اس لیے وہ تن تنہا آندھی میں چراغ جلاتے رہے اور اپنے خون جگر سے اسے روشن کرتے رہے۔ بزاز صاحب کے نظریات سے اختلاف کیا گیا ہے اور اب بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے خلوص ان کی اولوالعزمی، ان کی لگن اور ان کے احساس اور جذبے کی گرمی سے ان کا کوئی سیاسی حریف، ان کا کوئی نکتہ چین اور ان کا کوئی معترض انکار نہیں کر سکتا۔

پریم ناتھ بزاز کی پوری شخصیت کشمیر کی سماجی اور سیاسی زندگی میں خاصی متنازعہ فیہ رہی۔ انہوں نے اپنی انا کی آسودگی کی راہیں تلاش کیں اور ایسا کرنے کے لیے انہیں آگ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں سے گزرنا پڑا۔ انہیں مشکوک نگاہوں سے دیکھا گیا۔ ان پر تابڑ توڑ حملے ہوئے اور اپنے سیاسی خیالات کے لیے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنے کشمیری ہونے پر فخر کرتے رہے اور ہمیشہ ہر حال میں سر بلند رہے۔

بزاز کئی معاملات میں اپنے عہد کے پیش رو تھے۔ انہوں نے کشمیر میں اردو کا پہلا اخبار "وِتستا" نکال کر اردو صحافت

کا جھنڈا گاڑ دیا۔ وہ تحریک حریت میں عملی طور پر شریک ہونے والے
پہلے کشمیری پنڈتوں میں سے تھے۔ وہ شیر کشمیر کے پہلے سوانح
نگار تھے۔ اور اس موضوع پر ۱۹۳۵ء میں کشمیر کا گاندھی کے عنوان سے
اپنی کتاب شائع کی۔ وہ کسان مزدور تحریکوں کے بانی لیڈروں میں
سے تھے۔ وہ ریڈیکل ڈیموکریٹک سیاسی نظریے سے متاثر ہو کر کشمیر میں
اس کے پروگرام اور فلسفے کے سب سے بڑے نقیب تھے اور پوری
تن دہی سے اس تحریک میں سرگرم عمل رہے۔ ان کی تصنیف "شاعر انسانیت
(۱۹۵۳) عبدالاحد آزاد کی شاعری سے متعلق ہے۔ اس میں انہوں نے ناقدانہ
انداز نظر سے آزاد کے تخلیقی ذہن کے سوتوں تک پہنچنے کی کوشش کی ہے
آزاد کی مطبوعہ شاعری کو اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہوئے بزاز لکھتے ہیں:-

"ہم اس وقت ان کی شاعری کو ہی زیر بحث لانا چاہتے ہیں نثر
کو نہیں شاعری میں بھی ہم اس حصہ کو نظر انداز کرتے ہیں جو
ان کی ابتدائی زندگی سے متعلق ہیں۔ جب کہ وہ قومی سیاسی
اور سماجی سوالات کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیتے ہیں۔ آزاد
کی شاعری کا بیشتر حصہ ابھی شائع نہیں ہوا ہے بلکہ جو کچھ اس وقت
تک پبلک کی نظروں سے گزر چکا ہے۔ اتنا ہی ہماری تنقید کا موضوع
ہے"

(شاعر انسانیت از پریم ناتھ بزاز ص ۲)

اس کتابچے میں بزاز کی کسی گہری تنقیدی بصیرت کا پتہ نہیں چلتا اور نہ ہی اس میں
کوئی تنقیدی استدلال نظر آتا ہے لیکن اس کی ایک تاریخی اہمیت ضرور ہے۔
بزاز اپنے ادبی، سماجی اور سیاسی کارناموں کی وجہ سے
ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

## لالہ ملک راج صراف (۱۸۹۴ء — ۱۹۸۸ء)

انیسویں صدی کے اواخر میں ریاست جموں وکشمیر میں ایک عوامی اخبار جاری کرنے کی خواہش اہل علم کے ایک حلقے میں شدت سے پیدا ہوئی۔ اس سلسلے میں ابتدائی کوششیں پنڈت ہرگوپال کول خستہ اور سالگ رام سالک نے کی تھی۔ اس کے بعد اس سلسلے میں مولوی محمد الدین فوق نے بھی زبردست کوششیں کی لیکن یہ سب لوگ ناامید ہوئے اور انہوں نے پنجاب کے مختلف شہروں سے اخبارات جاری کئے۔ اس سلسلے میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے بدیا بلاس کو اولیت حاصل ہے۔ یہ ریاست کا پہلا اخبار سمجھا جاتا ہے۔ یہ اخبار ۱۸۸۲ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جاری کروایا تھا اور اس کا منصب سرکاری گزٹ سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ اس سلسلے میں خطہ جموں کے لالہ ملک راج صراف کا نام بطور خاص قابل ذکر ہے۔ جنہوں نے زبردست کوششوں کے بعد اس مہم کو سر کیا اور ۱۹۲۴ء میں اپنا اخبار "رنبیر" جاری کیا۔ اس لحاظ سے لالہ ملک راج صراف ریاست جموں وکشمیر میں اردو صحافت کے باوا آدم ہیں۔ اس بات کے باوصف کہ شروع شروع میں یہ اخبار ڈوگرہ شاہی کے مفادات کی ترجمانی بھی کرتا تھا۔ ان کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ "رنبیر" نے ہی ریاست کے لوگوں کو آہستہ آہستہ زبان دی ہے اور وہ آہستہ آہستہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگے جس کے لئے انہیں پنجاب سے نکلنے والے اور خاص طور سے لاہور سے نکلنے والے اخبارات کا مرہون منت رہنا پڑتا تھا۔ رنبیر کا پہلا شمارہ ۲۴ جون ۱۹۲۴ء کو جموں سے ہی شائع ہوا۔

لالہ ملک راج صراف ۸ اپریل ۱۸۹۴ء کو جموں خطے کے سانبہ علاقے میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم سانبہ میں پائی۔ اس کے بعد پرنس آف ویلز کالج جموں اور لا کالج لاہور میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ صحافت لالہ صاحب کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی چنانچہ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی وہ شیر پنجاب لالہ لاجپت رائے کے

روزنامہ "بندے ماترم" میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ۱۹۲۰ء میں شریک ہوئے۔ سال بھر کے بعد جب انہوں نے اپنی ریاست سے اپنا اخبار نکالنے کی سعی کی تو انہیں سرکار دشمن ہونے کا الزام دے کر اخبار نکالنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ کامیابی انہیں بعد میں حاصل ہوئی۔ شروع میں انہوں نے اپنا ہفتہ روزہ اخبار جاری کیا جو بعد میں روزنامہ ہو گیا تھا۔ اس اخبار کے ساتھ ساتھ انہوں نے بچوں کا ایک رسالہ رتن ۱۹۳۴ء میں شایع کیا۔ جو شمالی ہندوستان میں بچوں کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت پرچہ تھا۔ اپنے دونوں اخباروں میں انہوں نے اہل قلم کی ایک پوری نسل تیار کی تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ "رنبیر" اور "رتن" میں نہ صرف یہ کہ پورے ملک کے مشاہیر اہل قلم معاونت کرتے تھے بلکہ نئے لکھنے والے بھی شریک اشاعت ہوتے تھے۔ رنبیر کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے کشمیر اور جموں میں بہت سے ایسے نثر نگار اور شاعر پیدا کئے جو بعد میں ملکی شہرت کے مالک بن گئے۔

لالہ ملک راج صراف اپنی صحافتی قابلیت اور سرگرمیوں کے باعث صحافتی برادری میں تحسین و توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی کوششوں سے ہی ریاست جموں و کشمیر میں آل جموں و کشمیر جرنلسٹ ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر صراف صاحب ہی منتخب ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۴۳ء میں نیوز پیپرس ایڈیٹرس کانفرنس کی صدارت بھی کی۔ لالہ ملک راج صراف کافی معروف شخصیت تھے وہ مختلف سماجی تنظیموں کے ساتھ وابستہ رہے۔ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے صحافیوں کی عالمی کانفرنس کی نمایندگی ہلسنکی (فن لینڈ) میں کی۔ انہوں نے کافی سیاحت بھی کی تھی۔ جن میں یورپ کے کئی ممالک کے علاوہ سفر پاکستان اور سفر چین قابل ذکر ہیں۔ اپنے اخبار میں لکھنے کے علاوہ لالہ جی نے کئی اور کارنامے بھی انجام دیئے انگریزی میں ان کا FIFTY YEARS AS A JOURNALIST اور WHO IS WHO

قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح کا سفر نامہ پاکستان بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جس میں ان کے دلنواز اسلوب کو پہچانا جا سکتا ہے۔ لالہ صاحب ایک باغ و بہار شخصیت تھے صحافت کے توسط سے انہوں نے اردو ادب کی جو خدمت اس ریاست میں کی۔ وہ ناقابل فراموش ہے۔ ان کا اخبار تقریباً چوتھائی صدی تک نہ صرف ریاست میں بلکہ شمالی ہندوستان میں دلچسپی عزت اور توقیر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا رہا۔ ان کا انتقال ۱۹۸۸ء میں ہوا۔

●

## پریم ناتھ پردیسی — (۱۹۰۹ — ۱۹۵۵ء)

پریم ناتھ پردیسی کشمیری پنڈتوں کے سادھو خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ان کی ولادت ۱۹۰۹ء میں سری نگر میں ہوئی۔ ان کے جدِ امجد پنڈت سہج کول سادھو تھے جو اپنے زمانے میں بڑے صاحب ثروت تھے لیکن وقت کس کا ساتھ دیتا ہے۔ جب پردیسی کے والد پنڈت مہادیو کول کا زمانہ آیا تو گھر میں وہ ٹھاٹھ باٹھ نہیں رہی تھی۔ پنڈت مہادیو کول محکمہ انسداد سیلاب کاری اور ڈریج میں ملازم تھے۔ جہاں کچھ عرصہ کے بعد ان کو ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا لہذا پریم ناتھ سادھو کو شروع سے ہی افلاس اور ناداری کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن چونکہ خاندان مشترکہ تھا۔ اسلئے چولھا کسی نہ کسی طرح چلتا رہا۔ ان کے والد کا انتقال بچپن میں ہی ہوا۔ اسلئے ننہال منتقل ہوئے۔ یہیں ان کی تعلیم کا انتظام ہوا۔ اوائل بچپن میں ان کا نام مدھوسدن رکھا گیا تھا۔ لیکن بعد میں سکول کے کاغذات میں ان کا نام پریم ناتھ اندراج ہوا۔ میٹرک کا امتحان باغ دلاور خان کے سرکاری اسکول سے کامیاب کیا۔ اس کے بعد ایس پی کالج میں اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلہ حاصل کیا۔ لیکن اس اثنا میں ذمہ داریوں نے سر اٹھانا شروع کیا تھا۔ اور ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا جس کا انہیں زندگی بھر افسوس رہا۔

شروع میں پریم ناتھ نانہال میں ایک وکیل کی ایجنسی کرتے رہے۔ کچھ عرصہ مقامی ریلوے ایجنسی میں کلرک رہے پھر ان کا تقرر محالدار کی حیثیت سے محکمہ کسٹم و ایکسائز میں ہوا جہاں وہ برسوں تعینات رہے اس وقت تک سری نگر میں ریڈیو اسٹیشن کا قیام عمل میں آیا تھا۔ زندگی کے آخری زمانے میں یہاں ان کا تقرر بحیثیت پروگرام اسسٹنٹ کے ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں ۴۶ برس کی عمر میں معدے کے السر کے باعث وہ انتقال کر گئے۔

پریم ناتھ سادھو نے ایک ادب نواز گھرانے میں جنم لیا تھا۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے ہی ان کے حصے میں آیا تھا۔ ان کے دادا پنڈت مکند کول صاحب علم تھے اور اردو اور فارسی ادبیات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے یہاں علم و ادب کی محفلیں ہوا کرتی تھیں جن میں شہر کے اہل علم شریک ہوتے تھے۔ بیٹے کے انتقال کے بعد مکند کول اپنے پوتے کا خاص خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ پریم ناتھ اکثر دادا جان کی محفلوں میں بیٹھ کر بڑے بزرگوں کی باتیں اور مباحث سنا کرتے تھے۔ یہیں انہوں نے مولانا حسن نظامی، چکبست، حالی، اقبال، ٹیگور، پریم چند اور دوسرے اکابرین ادب کی شعری اور نثری تخلیقات سنیں اور ان بزرگوں کی مباحث سے ادب کے رموز سیکھتے رہے۔ انہی مجلسوں میں ان کے اندر کی سوئی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہونے لگیں۔ ۱۹۲۳ء سے انہوں نے اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانا شروع کیا۔ ابتدا میں وہ رونق کے تخلص سے شعر کہتے رہے اور لاہور کے اخبار عام، جموں سے نکلنے والے "رہبر" اور کچھ عرصہ تک پریم ناتھ بزاز کے "وِتستا" میں ان کا کلام شایع ہوتا رہا اور وہ ایک شاعر کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ اس دور کے چند شعر پیش ہیں۔

کوئی ارماں نہ نکلا بے بقا گلزار دنیا میں ۔۔۔ کلی پژمردہ دل کی رہ گئی وقف خزاں ہو کر

کب تلک ہو غرور رعنائی ۔۔۔ نازش حسن و جامہ زیبائی

۵ محبت ہے کاتب تقدیر سے شکوہ نیاز رونق — جہاں عشق میں ان کی نگاہ تقدیر ہوتی ہے

۵ خمار مست نگاہی ہی کم نہیں ساقی — نہیں ہے حاجت جام شراب رہنے دے

۵ حال دل کس سے کیا کہے کوئی — کس سے یہ ماجرا کہے کوئی

لیکن بعد میں انہیں یہ میدان راس نہ آیا اور ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۲ء تک جو شاعری انہوں نے کی تھی اس کو ترک کر کے نثر کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے ادب لطیف اور رومانی کہانیاں لکھنا شروع کیں جن سے انہوں نے اپنے لئے ایک مقام بنا لیا۔ لیکن وقت گزرنے کے بعد ان کو محسوس ہوا کہ وہ غلط نہج پر جا رہے ہیں۔ اس دوران انہوں نے منشی پریم چند، اعظم کریوی، کہاشتے سدرشن وغیرہ کی کہانیوں کے علاوہ انگارے گروپ کے قلم کاروں کی تخلیقات بھی پڑھ لی تھیں۔ دوسری طرف سے ریاست جموں و کشمیر میں بھی قومی تحریک کا آغاز ایک وسیع پیمانے پر ہوا تھا اور سیاسی بیداری نے ایک نئی کروٹ بدلی تھی۔ پردیسی جواب رونق کا تخلص ترک کر کے پردیسی کے قلمی نام سے لکھنے لگے تھے ایک نئے شعور کی آہٹ محسوس کرنے لگے تھے۔ ادب لطیف اور رومانی کہانیوں میں انہوں نے جس کھوکھلی جمال پرستی اور زندگی سے عاری تخیل پرستی کا اظہار کیا تھا۔ اس کو ایک دھچکہ پہنچا تھا۔ وہ اب اس بات پر یقین کرنے لگے تھے کہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کس طرح انسانی قدروں کو پامال کر سکتا ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ٹیگور کے اثرات کے تحت انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی معنویت ختم ہو چکی ہے۔ اسلئے انہوں نے اپنے مطالعے کو مشرقی اور مغربی فنکاروں کے خیالات سے وسیع تر کر دیا تھا۔ انہوں نے خود اعتراف کیا۔

"۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۸ء تک جو کچھ میں نے لکھا اس پر میں فخر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس وقت تک مجھے احساس ہی نہیں تھا۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے مجھ پر اپنے وطن عزیز کے کیا فرائض ہیں"

بیسویں صدی کے چوتھے دہے تک پردیسی ایک وسیع تر ادبی دنیا میں آچکے تھے انہوں نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر حلقۂ اربابِ ذوق نام کی ادبی انجمن تشکیل دی جس کی نشستیں انؑ کے گھر میں ہوا کرتی تھیں۔ اسی زمانے میں اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "شام وسحر" شائع ہوا۔

حلقۂ ارباب ذوق زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا نتب مشہور ادیب اور آج کل کے فلم ساز راما نند ساگر نے جن کا تعلق بھی اس ریاست سے ہے۔ پردیسی کے ساتھ مل کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک شاخ سری نگر میں کھولی۔ چنانچہ اس کے جلسوں میں اس وقت کے نوجوان قلم کار جمع ہوتے تھے اور اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے۔ اسی دوران غیر ریاستی ادیب بھی یہاں آکر اُن کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ جن میں خاص طور پر راجندر سنگھ بیدی، بلراج ساہنی، خواجہ احمد عباس، دیوندر ستیارتھی قابل ذکر ہیں۔

اس زمانے تک آتے آتے پردیسی کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ "دنیا ہماری" شائع ہو چکا تھا۔ یہ پردیسی کے افسانہ نگاری کا دوسرا دور تھا۔ ان کہانیوں میں نہ ٹیگور کا رنگ جھلکتا ہے اور نہ ہی نیاز کی رومانیت کا عکس ملتا ہے۔ موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے یہ کہانیاں اپنی الگ اور منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ کہانیاں اُن کے گہرے مشاہدے اور مطالعے کے بعد وجود میں آئی ہیں۔ یہاں کوئی جوش کوئی عنصر یا کوئی تلملاہٹ نظر نہیں آتی ہے۔ جو ترقی پسند مصنفین کا طرۂ امتیاز تھا۔ حالانکہ یہ کہانیاں اسی زمانے میں لکھی گئی ہیں۔ "دنیا ہماری" کے موضوعات مختلف ہیں۔ لیکن ان سب میں جو بات قدر مشترک ہے وہ انسانی نفسیات کا ادراک ہے۔ ان کہانیوں میں انسانی غم، انسانی بھائی چارگی ورانسانی قدروں کو پامال ہونے نہیں دیا گیا۔ پردیسی کا انداز بیان انتہائی سادہ ہے اور اس سلوب سے مختلف ہے جو شام وسحر کی اکثر کہانیوں میں نظر آتا ہے، وہ کم سے کم الفاظ

میں اپنے مقصد کو فنی پیرائے کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

پردیسی کی افسانہ نگاری کا آخری دور ۱۹۴۷ء کے آس پاس شروع ہوتا ہے۔ ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے وہ کھلے عام سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکتے تھے اور نہ ہی ایسی کہانیاں لکھ سکتے تھے جن میں براہ راست سیاسی عمل دخل ہو سکتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے کئی فرضی نام اختیار کئے اور پردے کے پیچھے سے عوام کو اپنی کہانیوں کے ذریعے سے غلامی، افلاس، اور استحصال کا احساس دلاتے رہے۔ اس زمانے میں انہوں نے بابو علائی، بالک رام باری وغیرہ فرضی نام استعمال کئے۔

پردیسی کی اکثر کہانیوں میں کشمیر کے خوبصورت مناظر نظر نہیں آتے۔ انہوں نے بہت کم یہاں کی جنت کا ذکر کیا ہے۔ بلکہ یہاں کے جہنم کدوں کی تصویر کھینچی ہے۔ یہاں کے فنکاروں، کاریگروں، مزدوروں، کسانوں، اور افلاس کے مارے لاکھوں لوگوں کی بدنصیبی کی کہانیاں رقم کی ہیں، جو سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے استحصال کے شکار ہو رہے تھے۔

پردیسی کی کہانیوں کا تیسرا مجموعہ بجھتے چراغ اُن کے انتقال کے بعد شایع ہوا۔ یہ دراصل اُن کے غیر مطبوعہ افسانوں کا انتخاب ہے۔ یہ افسانے ایک بے دار مغز، حساس اور باشعور کہانی کار کا احساس دلاتے ہیں۔ جنہوں نے پورے برصغیر کے ادبی حلقوں میں اپنے لئے ایک نمایاں مقام بنایا تھا۔ اور جنہیں اردو افسانے کی کوئی تاریخ فراموش نہیں کر سکتی ہے۔ جس طرح پریم چند نے اپنے آخری دور کی تحریروں میں ہندوستان کے کسانوں کو زبان بخشی ہے۔ اسی طرح پردیسی نے ان کہانیوں میں کشمیر کے اصلی روح کو منظر عام پر لایا ہے اور فنکارانہ ہنرمندی کے ساتھ کشمیریوں کے مصائب اور مسائل ان کے اصلی مزاج اور تیور ان کی سادگی اور شرافت ان کے عادات اور خصایل، ان کی مظلومیت اور احساس بغاوت کی عکاسی پورے خلوص اور دیانت داری کے ساتھ کی ہے۔ وہ اپنے ابتدائی دور

کی کہانیوں راجو کی ڈولی، سندھیا کا سراب، پارسل، ماں کا پیار، سلاخوں کے پیچھے جیسے افسانوں کی گرفت سے نکل کر نئی سڑک، خون اور سکے، جہاں سرحد ملتی ہے، نئی صبح، جھنجھنا، ڈھول، کاغذی جھنڈیاں، جواری، کتبے جیسی کہانیاں تخلیق کرتے ہیں۔ وہ ہیت اور تکنیک کے کئی تجربے کرتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو اپنے معاشرتی پس منظر میں اپنے پورے نفسیاتی عوامل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں صحافتی انداز نہیں ملتا بلکہ رنگارنگ کردار ملتے ہیں۔

پردیسی کے موضوعات کشمیری تھے۔ وہ کشمیری میں سوچتے تھے۔ انہیں کرشن چندر عزیز احمد اور ایسے بڑے فنکاروں سے ملال تھا کہ جنہوں نے یہاں کی بدنصیب قوم کے ساتھ درد کا رشتہ پیدا نہیں کیا اور ان کے غم کو ٹٹول کر نہیں دیکھا۔ یہ فرض خود انہوں نے انجام دیا۔ اسی لئے اُن کو بعض اوقات کشمیر کا پریم چند کہا جاتا ہے۔

## میر غلام رسول نازکی ( ۱۹۱۰ء )

میر غلام رسول نازکی کشمیر میں اردو زبان کے معماروں میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ ۱۶ مارچ ۱۹۱۰ء کو بانڈی پور میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان عربی اور فارسی کے عالموں اور فاضلوں کا تھا۔ خود ان کے والد عربی اور فارسی پر خاص دستگاہ رکھتے تھے۔ اس سے کسب فیض کر کے انہوں نے پرائیویٹ طور پر ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے بعد میں انگریزی ادبیات میں بی اے کے درجے تک تعلیم حاصل کی گھر میں علم و ادب کے پاکیزہ ماحول نے انہیں بچپن سے ہی شعر و شاعری کی طرف راغب کیا چنانچہ ابتدا سے ہی اُن کا کلام مختلف رسایل میں چھپتا رہا۔ ۱۹۴۹ء میں اُن کا پہلا شعری مجموعہ دیدۂ تر شایع ہوا۔ یہ شعری مجموعہ اُن کی غزلیات نظموں اور قطعات پر مشتمل ہے۔ نازکی

کو چار مصرعوں والے قطعات کہنے میں بڑی قدرت حاصل ہے۔ چنانچہ قطعات اور رباعیات کی بہت اچھی مثالیں بعد میں اُن کے یہاں کشمیری زبان میں بھی ملتی ہیں۔ غلام رسول نازکی کو فارسی زبان پر خاص قدرت حاصل ہے۔ اسی لیے ان کے کلام میں کلاسیکی روایات ملتی ہیں۔ اُن کی غزلوں میں ایک خاص قسم کی شگفتگی، گداختگی اور یاس کا پہلو ملتا ہے۔ غلام رسول نازکی نے زندگی کا بیشتر زمانہ محکمہ تعلیم میں ایک استاد کی حیثیت سے گزارا اس کے بعد وہ برسوں تک ٹیچرس ٹریننگ اسکول میں استادوں کو زباندانی پڑھاتے رہے۔ اسی دور میں محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر خواجہ غلام السیدین نے ٹریننگ اسکول سے ایک تعلیمی رسالہ "تعلیم جدید" جاری کیا تھا۔ جس میں مہاتما گاندھی کی بنیادی تعلیم کے نظریئے کی افہام و تفہیم کے سلسلے میں مضامین شایع ہوتے تھے۔ اس رسالے نے یہاں کے تعلیمی معیار کو بڑھانے میں خاص رول ادا کیا۔ اسکے مدیر غلام رسول نازکی ہی تھے جنہوں نے بڑی محنت سے اس رسالے کا اچھا معیار قائم کیا اور اردو زبان سکھانے میں بڑا رول ادا کیا۔ ریڈیو کشمیر کے قیام کے بعد نازکی صاحب کا تقرر پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے ریڈیو میں ہوا اور پنشن پانے تک وہیں قابل قدر خدمات انجام دیتے رہے۔

غلام رسول نازکی اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ اُن کے بیشتر مضامین اُن کے علم اور فن کے عرفان کی آگہی دلاتے ہیں۔ نازکی صاحب ہمارے یہاں کے کہنہ مشق اور بزرگ شاعروں میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ وہ ہمارے یہاں کے اساتذہ میں ایک اہم مقام کے مالک ہیں۔ اُن کی غزلیں روایت اور جدت کا ایک خوبصورت امتزاج ہیں۔ اُن کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی سادگی ہے۔ نازکی صاحب اب اردو بہت کم کہتے ہیں۔ وہ اپنی مادری زبان کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ چنانچہ کشمیری میں اُن کی رباعیات کا مجموعہ "نمرودنامہ" اور ایک تازہ شعری مجموعہ آوازِ دوست شایع ہوا ہے۔ آوازِ دوست پر انہیں گزشتہ برس ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

حرفی علم اللہ صاحب ۲۰۰۵ء

## حبیب کیفوی (۱۹۱۰ء—۱۹۹۱ء)

حبیب کیفوی ۱۹۱۰ء میں خطۂ جموں میں پیدا ہوئے تھے۔ میٹرکولیشن کامیاب کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لیا تھا۔ کہ گھر کے نامساعد حالات کے پیش نظر تعلیم کے سلسلہ کو منقطع کرنا پڑا۔ انہیں پیٹ پالنے کے لیے کئی پاپڑ بیلنا پڑے۔ کچھ عرصہ ریاستی محکمہ امداد باہمی میں سب انسپکٹر رہے۔ پھر کشمیر ٹینیٹ فیکٹری کے نام سے خیمہ سازی کا کارخانہ کھولا۔ یہاں بھی جی نہ لگا۔ تو اپنے نام حابسن (HABSON) نام کا تجارتی ادارہ قائم کیا۔ جو سرکاری اور غیر سرکاری تقریبوں کے لیے فرنیچر اور دوسرا ساماں فراہم کرتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے دوران وہ سرینگر میں تھے۔ ملک کی تقسیم ہوتے ہی۔ راولپنڈی پہنچے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

علامہ کیفی ۱۹۴۲ء میں ریاست جموں و کشمیر میں بطور اسسٹنٹ فارن سیکرٹری ملازم ہوئے۔ ریاست میں ان کی آمد انتہائی خوش آئند تھی۔ ان کے آنے سے شعر و سخن کی محفلوں میں رونق آگئی۔ اس زمانے میں اردو ادب کے کئی قدآور شخصیات ریاست میں مقیم تھیں۔ علامہ کیفی کے آتے ہی شعر و سخن کی محفلیں آراستہ ہوئیں۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اردو کا فروغ تھا۔ انہوں نے تلامذہ کا ایک بڑا حلقہ اکٹھا کر رکھا تھا جن کے کلام کی نہ صرف اصلاح دیا کرتے تھے بلکہ ان کے ذوق سلیم کی تہذیب بھی کرتے تھے۔ اس حلقے میں ریاست سے تعلق رکھنے والے جو سخنور تھے ان میں خاص طور پہ شندلال کول طالب، دینا ناتھ مست، ڈاکٹر عماد الدین سوز، نسیم رضوی، حبیب کیفوی اہم ہیں۔ علامہ کی محفلوں میں اثر صہبائی اور ناٹک ساگر کے شہرت یافتہ محمد عمر، محمد عمر نور الہٰی والے

حاضر ہوتے اور اکتساب فیض کرتے۔ ایسی ہی دلنواز محفلوں کے شب و روز میں حبیب اللہ حبیب کیفوی بن گئے اور اپنا اظہار شعر کے میڈیم سے کرنے لگے جنہیں علامہ کیفی سنوارا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں حبیب اللہ کالج میں زیر تعلیم تھے۔ کبھی کبھی شعر کہا کرتے تھے۔ اپنے دوست نسیم رضوی کے ہمراہ جب وہ پہلی مرتبہ پنڈت کیفوی کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو تعارف کے بعد انہیں اپنا کلام پیش کرنے کو کہا گیا۔ پنڈت جی نے اصلاح کے بعد اپنی طرف سے ایک شعر کا اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ تحفہ قبول کر لو

کام کالج کا کرو۔ خوب لکھو اور پڑھو
شعر کہنے میں غزل گوئی میں کیا رکھا ہے

لیکن اس کے باوصف حبیب اللہ شعر کہتے رہے اور پنڈت کیفی کی بارگاہ میں حاضر ہوتے رہے اور با قاعدہ طور پر شعر گوئی کیطرف مائل ہوئے۔ برسوں ہندوستان اور پاکستان کے پرچوں میں ان کا کلام شایع ہوتا رہا۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "آتش چنار" ۱۹۵۶ء میں شایع ہوا۔ قیام جموں کے دوران صاحبزادہ محمد عمر نے حبیب کیفوی سے کو نثر کیطرف مائل کیا۔ اور وہ شگفتہ نثر میں تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھتے رہے۔ حبیب کیفوی نے ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے بھی شہرت پائی چنانچہ پاکستان کے متعدد ریڈیو اسٹیشنوں سے اُن کے ڈرامے اور فیچر براڈکاسٹ ہوتے رہتے ہیں۔ "قرض" اور کوٹ، "تحفے"، بلی کے بچے، "پائینچہ"، کولمبس، "اشرفی"، مہمان خاص" ان کے اہم ڈرامے اور فیچر ہیں۔ وہ بچوں کے ادیب اور شاعر کی حیثیت سے بھی کافی معروف ہیں اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے رہے ہیں۔

حبیب کیفوی کو شعر و نثر پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ ان کا بنیادی موضوع کشمیر ہے، شعر ہو یا نثر ان کے یہاں کشمیر کی مٹی کی خوشبو ملتی ہے ان کے سیاسی نظریات سے قطع نظر ان کے سینے میں کشمیر کا جو عرفان اور کشمیر کا جو درد جھلکتا تھا اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ درد شعر و نغمے میں ڈھل کر ان کے جذبے کی لطافت کا احساس دلاتا ہے میں ان کی ایک نظم کے صرف چند بند پیش کروں گا۔

جہاں کی وسعتیں مایوس کر چکی تھیں مجھے
ترے کنارے پہ حاصل ہوا سکوں مجھ کو
تو جس زمیں سے گزر کر یہاں تک آیا ہے
اسی زمیں پہ پہنچنے کا ہے جنوں مجھ کو

---

سنا فسانۂ دلچسپ و دل نوازنہ کوئی
دلِ فسردہ کو جس سے قرار آ جائے
بیان چشمۂ شاہی ہو، ذکر شالامار
نظر کے سامنے رنگِ بہار آ جائے

---

چمن وہی ہے نگاروں کی سطحِ دریا پر؟
اسی طرح سے ہے جوبن پہ آبِ ڈل کہ نہیں؟
نظر کو دعوتِ نظارہ اب بھی دیتے ہیں؟
وہ سطحِ آب پہ پھیلے ہوئے کنول کہ نہیں؟

قطع نظر وطنیت کے موضوع کے، حبیب کیفوی غزل گوئی سے بھی طبعی مناسبت رکھتے تھے۔ اسی لیے نظمیہ شاعری کے ساتھ

ساتھ برابر غزل بھی کہتے تھے ان کی تازہ غزلوں کے چند نمونے ملاحظہ ہوں :-

دل میں کچھ ایسے رنگ سے وہ جلوہ گر ہے
سرشار جس کے کیف سے شام و سحر ہے
پھر بھی سراغِ منزلِ ہستی نہ پا سکے
گو مدتوں تلاش میں گرمِ سفر ہے
راہ طلب میں شوق ہی تنہا رفیق تھا
ہوش و خرد تو چند قدم ہم سفر ہے
یوں ہی تو بزم دوست فروزاں نہیں رہی
روشن کسی کے داغ جگر تا سحر ہے

---

فرصت کہاں کہ وعدہ فردا کا آزمائیں!
جیتا رہے گا کون ترے انتظار تک!
آشفتگی کا رنگ چھپائے نہ چھپ سکا!
روکے رہے اگرچہ زبان اختیار تک!
ہم احترامِ عشق میں سب کچھ اڑا چکے!
رونا ہے یہ کہ تم کو نہیں اعتبار تک
طے کر لیا ہے عشق نے ہر ایک مرحلہ
با صد وقار گوشۂ زنداں سے دار تک

---

دونوں عالم میں کوئی اس کا ٹھکانا ہی نہیں
آہ وہ جس سے مقدر میں نہ دنیا ہو نہ دین

سمجھتی دہر سے کچھ اور کبھی تابندہ ہوا
تیری عظمت کا تصور، تیری ہستی کا یقین
دل کی دنیا نہ لرزجائے کہ پھر سامنے ہے !
لالۂ رخسار کوئی، برق نظر شعلہ جبین !

---

حبیب کیفوی کا سب سے اہم کارنامہ ان کی گراں قدر تصنیف "کشمیر میں اُردو" ہے جو پہلی بار ۱۹۷۹ء میں مرکزی اُردو بورڈ لاہور پاکستان کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ اس کتاب کا پیش لفظ اُردو کے مقتدر نقاد ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے۔ کشمیر میں اُردو کی کہانی بڑی عرق ریزی سے تحریر کی گئی ہے۔ حبیب کیفوی نے اُردو شعروادب کی ان مختلف منزلوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے کشمیر میں اُردو زبان گزری ہے۔ اس تحقیقی کارنامے کی ترتیب اور تکمیل کے لیے حبیب کیفوی کو کشمیر سے دور رہ کر مناسب مواد کی کمی یا عدم موجودگی کے باعث کتنے ہفت خواں طے کرنا پڑے ہوں گے۔ اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔

حبیب کیفوی نے "اقبالیات" پر بھی کام کیا ہے ان کے کئی قابل قدر مضامین اقبال اکادمی پاکستان کے مجلے "اقبال ریویو" میں ملتے ہیں۔ علامہ اقبال کے سلسلے میں کشمیر کے تعلق سے ان کا ایک مضمون "کشمیر کی ایک اقبال شناس شخصیت" اقبال ریویو

برائے جولائی۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء (اقبال نمبر) میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں وہ منشی سراج الدین احمد کے بارے میں ایسی معلومات فراہم کرتے ہیں جس سے منشی سراج الدین احمد کی سخن سنجی اور اقبال شناسی کے نئے پہلو اہل نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ علامہ اقبال کے تعلق سے منشی صاحب کے بارے میں حبیب کیفوی کا یہ بیان اہم ہے:۔

"کشمیر میں اقبال شناسی میں کشمیر ریذیڈنسی کے میر منشی سراج الدین احمد کو جو مقام حاصل تھا۔ اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کشمیر ریذیڈنسی کے دفاتر سردیوں میں سرینگر سے سیالکوٹ آجاتے تھے۔ سیالکوٹ کے قیام کی وجہ سے علامہ اقبال سے اُن کے گہرے مراسم تھے اور رشتہ محبت و عقیدت علامہ اقبال کے آخری ایام تک قایم رہا۔"

حبیب کیفوی دورِ حاضر میں کشمیر کے ایک بزرگ قلم کار تھے۔ جنہوں نے نہ صرف اپنے قلم کی جولانیوں سے اُردو شعر و نثر میں پھول کھلائے ہیں بلکہ کشمیر میں اُردو کی دلپذیر داستان رقم کر کے ایک باصلاحیت ادبی مورخ کا منصب سنبھالنے کی باوقار کوشش کی ہے اور یہی کیا کم ہے۔

۱۸۹

# کشمیری لال ذاکر (۱۹۲۱ء

ریاست جموں وکشمیر میں جن لوگوں نے اردو ادب کی گراں قدر خدمت کی اور اس کی تعمیر میں قابلِ قدر کارنامے انجام دئیے ان میں کشمیری لال ذاکر کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ذاکر گزشتہ چالیس پینتالیس سال سے برابر لکھ رہے ہیں اور انہوں نے شعر و نثر دونوں میں اظہار خیال کیا ہے لیکن ان کا اصلی میدان فکشن ہے۔ انہوں نے بے شمار افسانے اور ناول لکھے جن کا اردو ادب میں اپنا مقام ہے۔ ہمارے لئے یہ بات باعث فخر ہے کہ ان کا تعلق کسی نہ کسی طرح ہماری ریاست کے ساتھ ہے۔

ذاکر کا پورا اور خاندانی نام کشمیری لعل موہن ہے اور وہ مہیال برہمن ہیں۔ اُن کے والد جناب گورداس رام موہن ریاست کشمیر میں محکمہ ٹورازم کے ساتھ وابستہ رہے اور اسکے بعد ریذیڈنسی میں ملازم ہو کر سری نگر آئے اور برسوں یہاں رہے۔ ذاکر کی والدہ میرپور کی رہنے والی تھیں۔ لیکن اُن کی پیدائش گنجاب میں ہوئی۔ وہ کشپ گوتر کے ساتھ وابستہ ہیں، یہ ایک بہت بڑی وجہ ہے کہ اُن کے نفسیاتی لاشعور میں ہمیشہ کشمیر بسا رہا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ "چونکہ کشپ ریشی ہمارے جد ہیں اسلئے ہم اُن کی اولاد ہونے کے ناطے کشمیری ہیں اور یہی وہ ذہنی مناسبت ہے جہاں میں اس وادی کو بھول نہیں پایا ہوں۔"

کشمیری لال ذاکر نے زندگی کے ابتدائی ایام پونچھ میں گزارے۔ جہاں اُن کے والد ٹورزم میں ملازم تھے۔ یہاں سے وہ تبدیل ہو کر اپنے خاندان کے ساتھ سری نگر آئے اور ذاکر نے اپنے بچپن کا بہترین زمانہ یہاں گزارا۔ نویں جماعت تک سری نگر کے ایس پی سکول کے طالب علم رہے۔ اس کے بعد جب پھر والد کا تبادلہ جموں ہو گیا تب ان کے ساتھ جموں گئے وہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کی میٹرک رنبیر ہائی سکول جموں سے ۱۹۳۵ء میں اور بی اے اور بی ٹی پرنس آف ویلز کالج سے بالترتیب ۱۹۴۰ اور ۱۹۴۵ میں پاس کیا۔ ایم اے انگریزی ادبیات میں پنجاب یونیورسٹی

سے ابعد میں کامیاب کیا۔ برسوں تک محکمہ تعلیم کے ساتھ وابستہ رہے جہاں سے عرصہ ہوا ریٹائر ہو چکے ہیں۔ آج کل ہریانہ اردو اکادمی کے سیکرٹری ہیں۔

کشمیری لعل موہن شروع سے ہی خواجہ غلام السیدین اور جعفر علی خاں اثر سے متاثر تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے اس قدر معتقد تھے کہ اپنے نام کے ساتھ ذاکر تخلص کے طور پر استعمال کرنے لگے اور موہن سے ذاکر ہو گئے۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا چنانچہ جعفر علی خاں اثر کے حلقۂ اثر میں آ گئے اور ان سے اصلاح لیتے رہے بعد میں اپنے ذوقِ سلیم کو اپنا رہنما بنایا۔

ذاکر اب بھی شعر کہتے ہیں لیکن شاعر سے زیادہ وہ ایک فکشن رائیٹر کی حیثیت سے عالم اردو میں جانے مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے نثر کی ابتدا افسانہ نگاری سے کی، چنانچہ ان کا پہلا افسانہ "الگ الگ راستے" ہمایوں لاہور میں ۱۹۴۳ء میں شایع ہوا۔ تب سے اب تک وہ بدستور نثر لکھتے ہیں۔ نثر میں ان کے رہنما اور مربی اوپندر ناتھ اشک تھے جو اپنی بیوی کوشلیا کے رشتہ داروں کے پاس اکھنور آیا کرتے تھے۔ شروع ہی میں ان کو اپنی کہانیاں دکھائیں۔ اشک جی نے اصلاح کے بجائے خود ہی کہانیوں کو تراش خراش کرنے کا مشورہ دیا۔ اس لئے بقول خود اپنی کہانیاں نذر آتش کیں۔ اس کے بعد ہی "الگ الگ راستے" تخلیق کی۔ اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۵۰ء میں اس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ حالی پبلشنگ ہاوس نے "کشمیر جل رہا تھا" شایع کیا۔ اس مجموعے کی کہانیاں قبائلی حملے کے پس منظر میں لکھی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد ذاکر کے افسانوں کے متعدد مجموعے منظر عام پر آئے۔ جن میں 'یہ کھنڈر میرے ہیں' ذاکر کی تین کہانیاں' 'چراغ کی لو' 'اداس شام کے آخری لمحے' 'بیر یوں والا فقیر' 'ایک کرن روشنی کی' وغیرہ شایع ہوئیں۔ لیکن بعد میں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ افسانوں سے زیادہ ناولوں کی طرف مائل ہوں' چنانچہ انہوں نے کئی شاہکار ناول تصنیف کئے' جن میں سیندور کی راکھ' 'انگوٹھے کا نشان' 'دھرتی سدا سہاگن' 'گرماں والی' 'لمحوں میں بکھری زندگی' 'جاتی ہوئی رت' 'خون پھر خون ہے'

سمندر صلیب اور وہ ڈوبتے سورج کی کتھا، چار میل لمبی سڑک، میں اسے پہچانتی ہوں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سلسلہ اب تک برابر جاری ہے۔ ذاکر کے فکشن میں بعض جگہوں پر ان کے لاشعور میں لیے ہوئے کشمیر کی متعدد تصویریں ملتی ہیں اور بعض جگہوں پر وہ جغرافیائی حصاروں کو توڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر لمحوں میں بکھری زندگی جموں و کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اسی طرح سمندر صلیب اور وہ اگرچہ گوا کی تحریک آزادی سے متعلق ہے لیکن اس کا پس منظر کشمیر ہے۔ ذاکر کا مشہور ناول لمحوں میں بکھری زندگی ان کی پونچھ کی زندگی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ جہاں ان کے والد کسی زمانے میں کام کرتے تھے۔ اس زمانے میں پونچھ ایک الگ ریاست تھی۔ اور ان کا قیام ریذیڈنسی میں تھا۔ جو قلعے کے اندر واقع تھی۔ یہاں گارڈ کی اجازت کے بغیر باہر جانے کی اجازت نہیں تھی اور نہ ہی باہر کا کوئی شخص اندر جا سکتا تھا۔ لمحوں میں بکھری زندگی اسی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس طرح سے یہ ایک سوانحی ناول ہے۔ ذاکر کو اردو کے مختلف اداروں سے اب تک متعدد انعامات ملے ہیں جس کے وہ مستحق بھی ہیں۔ بنیادی طور پر ذاکر اس معاشرے میں انسان کی بے بسی اور بے کلی کی کہانیاں رقم کرتے ہیں اور انسان کو اس کی کلی حیثیت میں اس کے مسائل کے ساتھ ملحوظ کر کے اس کو کہانیوں کا پیکر دیتے ہیں۔ چاہے وہ افسانے ہوں یا ناول۔ وہ ڈوگرہ استحصالی نظام کی پیداوار ہیں۔ اس لیے شروع سے ہی اس استحصالی کے خلاف ان کے دل میں ایک آگ دہک رہی ہے۔ اپنے ادب میں اس استحصال کی انہوں نے دھجیاں اڑا دی ہیں۔

ذاکر بنیادی طور پر فکشن رائٹر ہیں اور اپنے موضوعات سے ہٹ کر ان کا اسلوب اور ان کا اسٹائل فن کو بھانے والا ہے۔ ۱۹۵۳ء میں جب ان کا پہلا ناولٹ سیندھور کی راکھ شائع ہوا تھی انہوں نے اپنے اسلوب اور TREATMENT

کی ساکھ جما دی تھی۔ ذاکر نے موضوعات کے تنوع سے قطع نظر اپنے اسلوب کے اس آہنگ کی آبرو قائم رکھی ہے اور خوب سے خوب تر لکھا ہے۔

کشمیری لال ذاکر یقینی طور پر کشمیر کے ایسے اردو کے معمار ہیں جنہوں نے نہ صرف ریاست میں بلکہ ریاست سے باہر بھی اس زبان کی تعمیر و ترقی میں ایک نمایاں رول ادا کیا ہے۔

## تیج بہادر بھان (۱۹۳۱ء)

کشمیر میں اردو افسانے کی جو جیوت پریم ناتھ پردیسی نے جلائی تھی۔ اس کی لو میں اضافہ کرنے والوں میں تیج بہادر بھان کا نام سرفہرست ہے۔ تیج کے بچپن کا نام چمن لال تھا۔ لیکن بچپن سے ہی سرکشی اور بغاوت خون میں رچی ہوئی تھی۔ کسی بات کو آنکھیں بند کر کے قبول نہ کرنے والا یہ سر پھرا ہر مخالف چیز سے ٹکراتا تھا۔ اس لیے بچپن کا چمن لال آٹھویں درجے میں آکر بہادر کہلایا اور تیج بہادر کا نام پایا۔

تیج بہادر بھان ۱۰ نومبر ۱۹۳۱ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ والد پنڈت کاشی ناتھ بھان ایک کھاتے پیتے زمین دار تھے گھر میں جاگیر شاہی ماحول تھا۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی باغی طبیعت سے جب تک زندہ رہے بالکل خائف رہے۔ وہ نہ جانے اپنی دولت کے سہارے سے اپنے بیٹے کو کیا بنانا چاہتے تھے۔ لیکن سر پھرا بیٹا ان کے بتائے ہوئے راستے پر نہ چل سکا۔ ایف ایس سی تک باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد تیج نے ٹیکنکل انجینیرنگ میں ڈپلومہ حاصل کیا

کچھ عرصہ تک ٹریکٹر چلاتے رہے۔ بعد میں محکمہ آب کاری میں چیف فورمین کی حیثیت سے ریٹائر ہو گئے۔

بچپن سے ہی تیج کو پڑھنے لکھنے ڈراما اور اداکاری کے ساتھ دلچسپی رہی ہے ڈراما اور اداکاری تو چھوٹ گئی ہے لیکن لکھنے پڑھنے کا شغل جاری ہے۔ ٹریکٹر چلانے والے اور مشینوں کے پرزے درست کرنے والے اس انجینیر کے افسانے پڑھکر حیرت ہوتی ہے کہ زندگی کا اس قدر گہرا مشاہدہ اس نے کہاں سے سیکھا ہے۔ تیج کے پاس شاعرانہ اظہار کا کوئی وسیلہ نہیں، شاید افسانویت پیدا کرنے کی زبان بھی نہیں اور اسٹائل انتہائی کھردرا ہے۔ لیکن کرختگی کے پس پشت ایک بڑے فن کار کی روح لرزتی ہوئی ملتی ہے۔ کچھ تلے الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کا بیان اس کے فن کا سب سے بڑا معجزہ ہے اور یہ اعجاز ہمارے یہاں کے بہت کم کہانی کاروں کو حاصل ہوا ہے۔

تیج نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز باقاعدہ طور پر ۱۹۵۱ء میں کیا۔ بچپن میں عشق کا سوانگ رچایا تھا لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس ناکامی نے احساس کو زندہ رکھا اور قلم کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ تیج کے تخلیقی سفر کا حرف آغاز یہاں سے ہی شروع ہوتا ہے۔ اس نے کہانی کے فن کو آزمایا۔ اس فن کے متعلق نہ کسی فارمولے پر غور کیا نہ اصولوں کا مطالعہ کیا۔ اپنے لیے خود ایک تکنیک وضع کر لی۔ جاننے والوں نے حوصلہ دیا کہ ادیب بن گئے ہو، اس احساس نے اعتماد بیدار کیا۔ زندگی کا مشاہدہ غور سے کیا۔ تیج نے باضابطہ طور پر اردو کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اسی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ اسی لیے تیج کی زبان آج بھی انشا اور املا کے

تملطیوں کا پلندہ ہے اور تیج کے ناقدین اس بات کو خوب اچھالتے ہیں لیکن عام لوگ ان کی کہانیوں کو پسند کرتے ہیں۔ ان کے معترضین اور ناقدین بھی تیج کے فنی برتاؤ اور کہانی سننے کے حق میں ایمان لاتے ہیں۔ تیج بہادر بھان ہم برس سے مسلسل لکھتے آرہے ہیں۔ اور اب تک لکھ رہے ہیں۔ کلچرل کانگریس کے ساتھ وابستگی کے باعث شروع میں "لال چینری" اور "سرمایہ دار کا خواب" جیسی کہانیاں لکھیں۔ ان کہانیوں میں فن سے زیادہ پروپگنڈے کی لو آتی ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ تیج کا فن نکھرتا گیا اور آج ان کے یہاں کہانی کے فن کا ایک بھرپور اور نکھرا ہوا انداز ملتا ہے۔ تیج اس فن میں کسی کے مقلد نہیں۔ انہوں نے اپنے لیے ایک مخصوص تکنیک وضع کرلی ہے۔ تیج نے کلچرل کانگریس سے زمانے میں ہی اپنی کہانی " واپکن " سے لوگوں کو چونکا دیا جو خواجہ احمد عباس کے رسالے "سرگم" میں چھپی تھی اور جس نے انعام بھی حاصل کیا تھا۔ مختصر افسانے کے لیے جس تکنیک اور جس فنی چابکدستی کی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں شاید ہی کسی افسانہ نگار کو اس معیار کی ہنرمندی حاصل ہے وہ جہلم کے سینے پر" سے "در عورت"، تک تیج بہادر بھان نے خاصا تخلیقی سفر طے کیا ہے ان کے خاص موضوعات میں نفسیاتی اور سماجی مسائل ہیں جن کو انہوں نے تخلیقی آرٹ کے حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔

**حامدی کاشمیری (۱۹۳۲ء)**

حامدی کاشمیری ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ایس پی کالج سرینگر

میں پائی۔ ۱۹۵۴ء میں انگریزی ایم اے کا امتحان پاس کیا، اور ۱۹۵۸ء میں
اُردو میں بھی امتیاز کے ساتھ ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے
کے بعد وہ ایس پی کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ انہوں نے کچھ عرصہ کے لیے جموں و کشمیر کلچرل اکادمی
میں بھی کام کیا۔ ۱۹۶۲ء میں حامدی کا تقرر جموں و کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں
لیکچرار کی حیثیت سے ہوا۔ اسی دوران انہوں نے جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات
کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جلد ہی وہ ریڈر اور بعد میں پروفیسر
مقرر ہوئے۔

حامدی کاشمیری افسانہ، ناول، ڈراما، اور تنقید سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن
اُن کا اصل میدان شاعری اور تنقید ہے۔ انہوں نے ۱۹۴۶ء۔ ۱۹۴۷ء سے
شاعری کی شروعات کی تھیں۔ جب وہ سری نگر کے باغ دلاور خان کے اسٹیٹ
ہائی سکول کے طالب علم تھے۔ انہیں منشی محمد صادق جیسے شفیق اور لائق استاد
ملے جب شعروں کی تشریح کرتے تو ایک سماں بندھ جاتا۔ کشمیر کے کہنہ مشق شعراء
میں کتنے ہی اہل ذوق ہیں جنہوں نے اپنے علم کا چراغ ان کے چراغ سے روشن کیا۔
حامدی کو ابتدا میں منشی صاحب نے تحریک دی۔ اور ان کے لاشعور میں دفن
شاعر سامنے آیا۔ اور وہ نعتیں لکھنے لگے۔ ان کی نعتیں محافل میلاد میں پڑھی
جانے لگیں۔ ابتدا میں کشمیری میں اشعار لکھے۔ منشی صاحب نے اصلاح دی۔
اور انہیں آگے بڑھنے کا راستہ دکھایا۔ آج بھی بہوری کدل کی مسجد میں حامدی
کی نعتیں پڑھی جاتی ہیں۔ کالج کی رنگین اور رومان پرور فضا نے اس چنگاری
کو ہوا دی۔ کالج کے بزم ادب، لائبریری اور اہل ذوق طلبہ اور طالبات کی ہم
نشینی نے حوصلہ دیا۔ اور وہ اپنے ایک دوست لکھن لال محو (آج کل
کے مشہور صحافی) کے توسط سے مشہور شاعر شہ زور کاشمیری کے پاس پہنچے اور

زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ شہ زور، سیماب اکبرآبادی کے حلقۂ تلمذ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ فارغ الاصلاح ہوکر اب آزادانہ طور پر مشق سخن کرتے تھے۔ زبان و بیان پر ماہرانہ قدرت رکھتے تھے۔ حامدی نے اپنے سنجیدہ کلام پر شہ زور سے اصلاح لے کر عروض اور زبان و بیان کے رموز سیکھے۔ اور اب کالج میگزین کے علاوہ مقامی رسائل میں ان کا کلام شائع ہونے لگا۔ ابتداء ہفت روزہ وکیل سے کی جب ذرا قدم جم گئے تو ماہنامہ شاعر کے لیے لکھنے لگے۔ شاعر کے مدیر نامدار اعجاز صدیقی نے ہمت اور حوصلہ دیا۔ یہیں سے باضابطہ طور پر حامدی کے تخلیقی سفر کا آغاز ہوا لیکن اس سفر میں وہ بالکل تنہا نہیں تھے۔ ان کے لاشعور میں کشمیری موسیقی کی ان محفلوں کا رچاؤ بھی تھا جن میں وہ بچپن میں متعارف ہو چکے تھے۔ اور ان کی والدہ کی وہ شفیق گنگناہٹ بھی جو گھر میں اپنے چرخے کے پہیے کو گھماتے ہوئے ان کے ہونٹوں سے پھسل کر ماتا کا رس انڈیلتی تھی۔ گھر کے ماحول نے حامدی کو جملہ رچیہ، IMAGINATIVE بنا دیا تھا۔ اور اس کے جسمانی وجود کے خول کے اندر ایک شاعر، ایک کہانی کار اور ایک کلاکار کی روح تپ رہی تھی۔ اور آج تک مسلسل تپے جا رہی ہے

۱۹۶۶ء میں جب وہ "اردو شاعری پر مغربی اثرات" کا تحقیقی مقالہ لکھ کر فارغ ہوئے تو ان کے ذہن کے دریچے کھل گئے تھے۔ مقالے کی تیاری کے دوران انہیں تنقید سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس وقت تک وہ محض ایک افسانہ نگار اور شاعر تھے۔ لیکن اب انھوں نے شعر کہنا کم کر دئیے ہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں غالب کے تخلیقی سرچشمے، نئی حسیت اور عصری اردو شاعری کا رگہِ شیشہ گری (میر کا مطالعہ) غالب اور اقبال،

ناصر کاظمی کی شاعری، حرفِ راز (اقبال کا مطالعہ) امکانات، وغیرہ جیسے بہت سے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ وہ چند برسوں کے اندر ہماری ریاست کے ناقدوں میں سرِ فہرست نظر آتے ہیں۔ ان کا پہلا تحقیقی مقالہ اُردو نظم پر یورپی اثرات تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کا ہے اور اُردو نظم کا ایک خالص تجزیاتی مطالعہ پیش کرتا ہے اور حالی اور آزاد کے دور سے ۱۹۱۴ء تک اُردو نظمیہ شاعری پر محیط ہے۔ غالب کے تخلیقی سرچشمے میں غالب کی نفسیات پیش کرتے ہوئے غالب کے فکری سرچشموں کی بازیافت کرنے کی بہت اچھی کوشش ہے۔ حامدی نے آرٹ کی تعیین کی قدر کرتے وقت شاعر سے زیادہ شعری کائنات کو اہم قرار دیا ہے اور آرٹ کی فنی اور جمالیاتی قدر و قیمت کو اہمیت دی ہے۔ نئی حسیت اور عصری شاعری میں نئے شعری احساس اور جذبے کی دید و دریافت کے ساتھ عصری حسیت کی اصل اور اس کے مباحث کا مطالعہ پیش کیا۔ اور کارگہِ شیشہ گری میں میر کی شاعری میں پوشیدہ تخیلی کائنات میں سیاقی اور علامتی پیکروں کی تلاش اور ان کی معنویت کا مطالعہ ملتا ہے۔ یہ سب مستحسن کوششیں ہیں اور اُردو تنقید میں ایک نئی آواز کا احساس ہوتا ہے۔ حامدی نے تنقید میں ایک نئی راہ اختیار کر لی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تنقید کی یکسانیت، تکرار لفظی اور غیر متعلقہ تشریح تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس لیے انہیں ایک نئے انداز سے سوچنے کی تحریک ملی۔ وہ شدت سے ایک ایسے رویے کی طرف مائل ہیں جو شعر فہمی اور شعر سنجی کے معروضی معیار کو تشکیل دے۔ اس نظریئے کو لے کر وہ آج کل تنقید سے متعلق ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔

حامدی اپنے نظریات کے باعث اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب

ہو چکے ہیں۔ ان کے مداح اور معترض دونوں حلقے موجود ہیں۔ لیکن نئی نسل سے تعلق رکھنے والوں میں وہ قدر و احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔ حامدی نے اپنے پہلے شعری مجموعے "عروس تمنا" سے "شایانِ" اور "نئا لاحرف" تک ایک طویل ذہنی سفر طے کیا ہے۔ حسن و جمال کی عشوہ طرازیوں اور رومانی اظہار خیال کے بعد ان کے شاعرانہ لہجے، آہنگ اور ڈکشن میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ ان کے یہاں ایک نئی شعری کائنات، آسیب زندگی، غیر یقینیت، نارسائی اور نادیدہ طلسمی دنیاؤں کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے وہ استعاراتی اظہار سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بالکل نئے شاعر نہیں ہیں بلکہ پرانی اور نئی نسل کو ملانے والی کڑی ہیں۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

ے قبائیں چاک پھولوں کی، تو تکمیل شعلۂ آواز
قیامت خیز ہے دوشیزۂ فطرت کی انگڑائی

ے فلک سے آہی گیا میری آہ کا یہ جواب
وہ دل ہی کیا کہ جو سوز الم کی لائے نہ تاب

ے تیرے چہرے پہ غم کا سایہ ہے — کتنے لمحوں کے چاند گہنا لے

ے ان سے بھی لرزہ خیز تھے منظر کہیں کہیں — پھنکارتے تھے سیالوں کے پیکر کہیں کہیں

ے جتنے کرم تھے کر لیے اب اک کرم کرو — دن ڈوبنے سے پہلے میرا سر قلم کرو

ے پانیوں پر کالی آوازیں رقم ہوتی گئیں — روشنی کے جسم ڈوبے تہہ نشیں ہوتے گئے

ے صبح دیکھا پانی ہی پانی تھا کوئی نہ تھا — رعنا پیکر تھے شب مہتاب خمیازہ تھا۔

حامدی کے افسانوں کے کئی مجموعے بہت پہلے شائع ہو چکے ہیں جن میں وادی کے پھول، برف میں آگ اور سراب شامل ہیں۔ ان کے علاوہ پرچھائیوں کا شہر (ناولٹ) اُن کے تخلیقی سفر کا اہم موڑ ہے۔

## پشکر ناتھ (۱۹۳۳ء)

پشکر ناتھ ۱۹۳۳ء میں بٹہ یار، سرینگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی اسکولوں میں حاصل کی۔ ۱۹۳۲ء میں جموں و کشمیر یونیورسٹی سے گریجویشن کر کے اکاؤنٹینٹ جنرل کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ یہاں مختلف عہدوں پر فائز رہے اور برسوں کی خدمات انجام دینے کے بعد اب وہاں سے ریٹائر ہو گئے ہیں۔

پشکر بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا شوق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ وہ "دشتِ تمنا" کے نام سے بہت پہلے ایک ناول بھی لکھ چکے ہیں[1] لیکن اُن کا پہلا عشق افسانہ ہی ہے۔ اس میدان میں انہوں نے بعض اچھے تجربے بھی کئے ہیں۔

پشکر ناتھ دورِ حاضر کے اہم کہانی کار ہیں۔ ان کے چار مجموعے "اندھیرے اُجالے" "ڈل کے باسی اور عشق کا چاند" "اندھیر الور کا رخ کی دنیا" شائع ہو چکے ہیں۔ پشکر نے ایک رومان نگار کی حیثیت سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ وہ "بیسویں صدی" دہلی کے توسط سے کشمیر میں پہچانے گئے لیکن بہت جلد انہوں نے اپنے منصب کو پہچان لیا اور رومانوں سے اُتر کر انہوں نے کشمیر کی زندگی کے کرب کو اپنے افسانوں میں ڈھال دیا۔ پشکر کا مشاہدہ عمیق ہے وہ فلسفہ نہیں بگھارتے اور نہ سیاست کے کرتب دکھاتے ہیں۔ وہ روزمرہ کی زندگی سے اپنی کہانیوں کا مواد اخذ کرتے ہیں۔ پشکر ناتھ کی کہانیوں میں جذبے اور احساس کا ادراک ملتا ہے اور ایک منجھا ہوا شعور بھی۔ ان کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے جس کی مدد سے انہوں نے خوب سے خوب تر لکھا ہے۔ پشکر نے اپنے طویل تخلیقی سفر کے دوران فارم کے کئی تجربے

---

[1] یہ ناول ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوا ہے

گئے ہیں۔ کئی کہانیاں انہوں نے ناول کی تکنیک میں بھی لکھی ہیں۔ بعض
میں داستانی تکنیک کا التزام کیا ہے۔ اور بعض میں صرف بیانیہ انداز
ملتا ہے۔ کہیں کہیں چشمۂ شعور کی تکنیک کو بھی برتا ہے۔ لشکر بدلتے
ہوئے وقت کے ساتھ بدلے ہیں۔ مشاہدے کے ساتھ ساتھ ان
کے مطالعے کا آہنگ بھی ان کی نئی کہانیوں میں نظر آتا ہے "کہانی پھر
ادھوری رہی" سے لیکر "عشق کا چاند اندھیرا" تک لشکر نے ایک طویل تخلیقی
سفر طے کیا ہے۔ ادھر حالیہ برسوں میں انہوں نے چند کہانیاں ایسی بھی
لکھی ہیں جن میں ابہام علامیت، تجریدیت اور جدید کہانی کی بیشتر خصوصیات کو
شعوری طور پر اپنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے افسانوں
میں "قصہ پن" کی خصوصیت سے اجتناب نہیں کر سکے ہیں:

## کشوری منچندہ (سنہ ۱۹۲۹ء)

کشوری منچندہ ۱۹۲۹ء میں جموں میں پیدا ہوئے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن
سے ہی تھا۔ اسی شوق کی بدولت معلمی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ
انھوں نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی اور ایم۔ اے (اردو) اور بی۔ ایڈ کے امتحانات
پرائیویٹ طور پر پاس کیے۔

کشوری منچندہ ہمارے جانے پہچانے کہانی کار ہیں۔ وہ ایک عرصے سے اپنی روح
کا درد کہانیوں کے وسیلے سے بیان کرتے رہے ہیں۔ وہ صرف ذہنی ترنگ کے اظہار پر
اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان پیچ در پیچ تجربات پر سے پردے بھی سرکاتے ہیں جو دل کے
کواڑ پر دستک دیتے ہیں۔ کشوری منچندہ کو کہانی سننے کا فن آتا ہے اور آج کے دور
میں جب ہمارے افسانوں میں کہانی پن عنقا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ افسانے کے اس عنصر
سے آنکھ نہیں چراتے۔ ان کا انداز بیانیہ ہی لیکن ان کی بعض کہانیاں سوالیہ نشان بن کر
قاری کا دامن تھام لیتی ہیں اور یہ بڑی بات ہے۔